الرسالہ
Al-Risala

April 1999 • [redacted] • Rs. 9

کوئی کام صرف کرنے سے ہوتا ہے نہ کہ
کہنے سے۔ مگر اکثر لوگ کہنے کو کرنے کا
بدل سمجھ لیتے ہیں۔

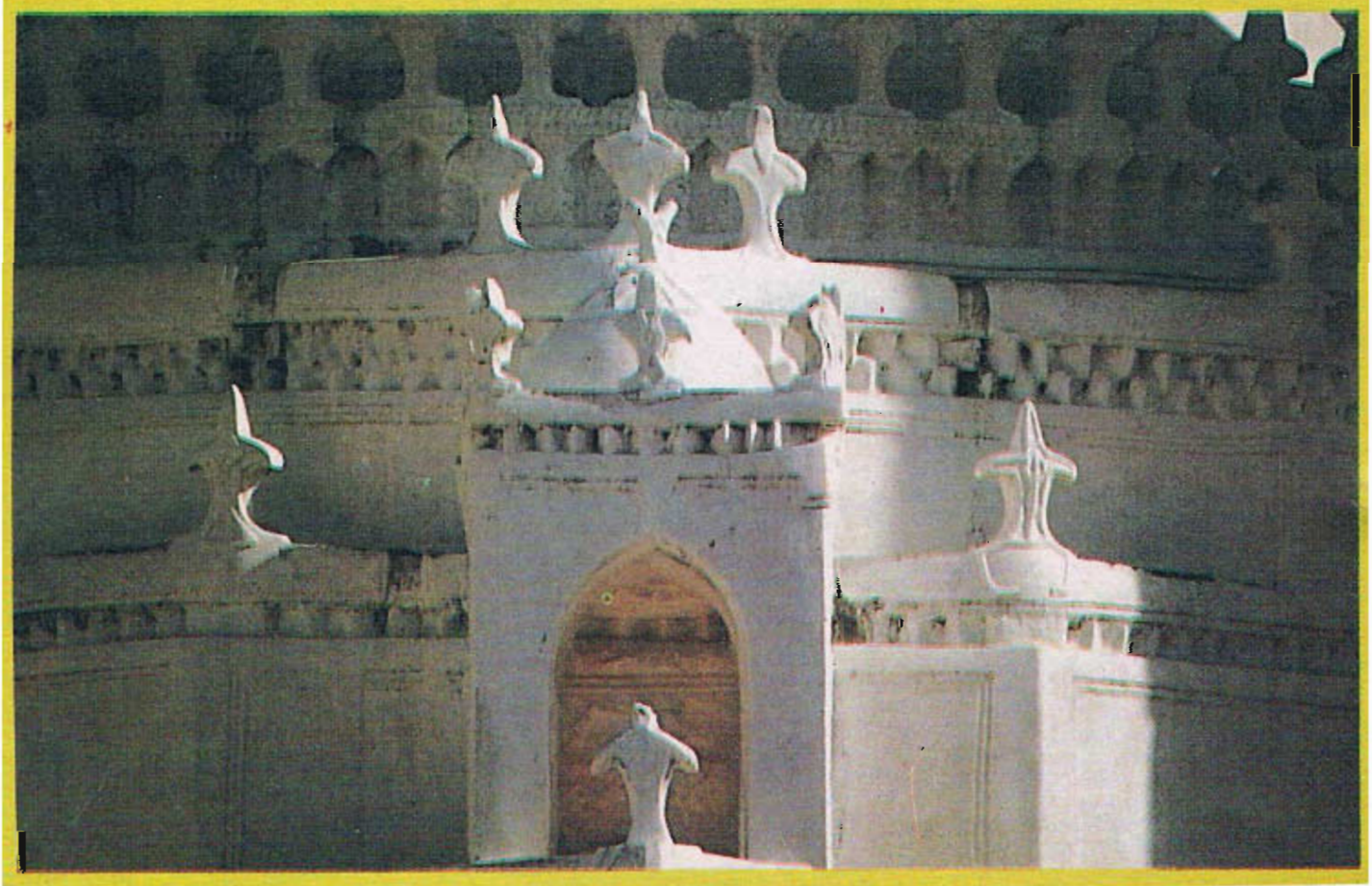

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	30.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	40.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروانِ ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	25.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	85.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4.00
تاریخ دعوت حق	5.00

مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	45.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	40.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفر نامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

Al-Risala Book Centre

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013 • Tel. 4625454, 4611128 • Fax 4697333

e-mail: skhan @ndf.vsnl.net.in • http://www.alrisala.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel.(4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Sanlyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

اپریل 1999 شمارہ 269

فہرست — صفحہ

خطرناک کھیل	4
جنتی کون	7
اختیارانہ عبادت	8
نقصان نہیں	9
ترکی کا سبق	10
مثبت فکر	13
ترقی کا راز	14
مسئلہ یا چیلنج	16
حسد کا نقصان	17
پیغمبر کی شخصیت	19
حیوانی زندگی	21
کنورزن کا مسئلہ	22
مراقبہ	35
سوال جواب	38
ایک انٹرویو	43
اسلام کا طریقہ	45
خبرنامہ اسلامی مرکز	47

خطرناک کھیل

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا یرمی رجل رجلا بالفسق ولا یرمیه بالکفر الا ارتدت علیه ان لم یکن صاحبه کذلك (مسند الامام احمد بن حنبل، الجزء الخامس، صفحه ۱۸۱) جب بھی ایک آدمی دوسرے آدمی پر کافر یا فاسق ہونے کا الزام لگاتا ہے تو ضرور یہ الزام خود قائل کی طرف لوٹ آتا ہے اگر دوسرا آدمی ویسا نہ ہو۔

ایک واعظ اگر نام کے تعین کے بغیر نصیحت کرے اور یہ کہے کہ لوگوں کا کیا حال ہو گیا ہے کہ وہ کفر اور فسق جیسے اعمال میں مبتلا ہو رہے ہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی عمومی نصیحت کی مثال خود رسول اللہ ﷺ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن نام کے تعین کے ساتھ اگر کسی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ کافر ہے یا فاسق ہے یا مرتد ہے یا بت پرست ہے، تو یہ ایک بے حد خطرناک کھیل ہو گا۔ ایسا قول اگر اللہ کے علم کے مطابق شخص مذکور کے لئے درست نہ قرار پاتا ہو تو وہ فضا میں تحلیل نہیں ہو گا بلکہ وہ لوٹ کر خود قائل کی طرف آجائے گا۔ یعنی قائل نے دوسرے شخص پر جو الزام لگایا ہے وہی الزام خدا کے رجسٹر میں خود قائل کے خانہ میں لکھ دیا جائے گا۔ اور آخرت میں اس کا انجام برعکس طور پر وہی ہو گا جس کا مستحق اس نے دوسرے کو ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔

یہ بلاشبہ ایک بے حد سنگین بات ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کسی کے بارے میں اس طرح کے سخت الزامی الفاظ بولنے سے آخری حد تک پرہیز کرے۔ اس طرح کے معاملات میں بولنے سے زیادہ بہتر ہے چپ رہنا اور اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے لئے بولنا ضروری ہو گیا ہے تو اس پر فرض کے درجہ میں لازم ہو گا کہ وہ کسی کے بارے میں ایسا سخت حکم لگانے سے پہلے اس کے بارے میں ہزار بار سوچے۔ وہ آخری ممکن حد تک اس کی تحقیق کرے اسی کے ساتھ وہ اس کے بارے میں اہل علم اور اہل تقویٰ سے مشورہ کرے۔ ان سارے تحقیقی

اور احتیاطی مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اگر اس کا ضمیر مطمئن ہو کہ اس معاملہ میں اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بولے اور اپنے اس قول کی بنا پر وہ اللہ کے یہاں پکڑا نہیں جائے گا تو اس کے بعد وہ بول سکتا ہے۔ اگرچہ پھر بھی مذکورہ اندیشہ بدستور باقی رہے گا۔ کیونکہ موجودہ دنیا میں مومن کی ذمہ داری نصیحت اور تبلیغ ہے نہ کہ دوسروں کے بارے میں کافر اور فاسق اور مرتد اور بت پرست ہونے کا اعلان کرنا۔

آسٹریلیا کا ایک قدیم ہتھیار ہے جو بومرینگ (boomerang) کہا جاتا ہے۔ اس کی صفت یہ ہے کہ پھینکنے کے بعد اگر وہ نشانہ پر نہ لگے تو وہ خود پھینکنے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔ اسی سے بومرینگ افکٹ کی اصطلاح بنی ہے۔ اس سے مراد ایک ایسا عمل ہے جو خود عامل کے اوپر الٹا پڑے۔

اس اصطلاح کو اگر استعمال کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کو کافر یا فاسق یا مرتد یا بت پرست کہنا ایک بومرینگ کھیل ہے۔ یہ ایک ایسا خطرناک پتھر ہے جو اگر نشانہ پر نہ لگے تو وہ خود پھینکنے والے پر آکر گرے گا۔

عباسی خلافت کے دور میں عقلی بحثوں کا ہنگامہ شروع ہوا۔ اشاعرہ اور معتزلہ اور متکلمین کے درمیان غلو کی حد تک شدید بحثیں جاری ہو گئیں۔ ہر ایک دوسرے کے خلاف سخت ترین الفاظ بولنے لگا۔ مثلاً اہل نقل نے اہل عقل کے خلاف فتوی دیا کہ من تمنطق فقد تزندق (جس نے علم منطق سیکھا وہ زندیق ہو گیا) دوسری طرف اہل عقل (معتزلہ) نے یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص قرآن کو قدیم مانے وہ کافر ہے۔

تکفیر و تفسیق کا یہ ہنگامہ کئی سو سال تک جاری رہا یہاں تک کہ علماء کے درمیان عقائد کا یہ مسئلہ مسلمہ طور پر مان لیا گیا کہ: لا نکفر احداً من اھل القبلۃ (اہل قبلہ میں سے کسی کو ہم کافر نہیں کہتے) یعنی جو شخص قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا

ہے کسی بھی حال میں اس کی تکفیر نہ کرو کیونکہ ایسا کوئی مسلمان نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا جو کعبہ کے بجائے کاشی یا ویٹکن کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کو کافر یا مرتد یا بت پرست کہنا سرے سے کوئی دینی کام ہی نہیں۔ اسلام میں عمل کی بنیاد نیت پر رکھی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر یا مرتد یا بت پرست وہ آدمی ہے جو اپنی نیت کے اعتبار سے اس قسم کا برا فعل کرے، اور نیت کا علم چونکہ صرف خدا کو ہے اس لئے کسی اور کا یہ کام ہی نہیں کہ وہ دوسروں پر اس قسم کا الزامی ٹھپہ لگانا شروع کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسا الزامی ٹھپہ لگانا سادہ طور پر صرف ایک گناہ نہیں ہے، بلکہ وہ بدترین قسم کی سرکشی ہے۔ وہ خدا کے قلم کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش ہے۔ جو آدمی ایسی کوشش کرے وہ خدا کے قلم کو حاصل کرنے میں تو کامیاب نہیں ہوگا، البتہ وہ خدا کے یہاں سرکشی کا مجرم قرار پائے گا اور جو سزا وہ دوسرے شخص کو دینا چاہتا تھا، اس کو وہ خود زیادہ بری شکل میں بھگتنے پر مجبور ہو جائے گا۔

مومن کا کام تکفیر نہیں ہے بلکہ تبلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو نظر آئے کہ فلاں شخص کے اندر ایک برائی پیدا ہو گئی ہے تو آپ اس سے ملیں اور خیر خواہی اور نصیحت کے انداز میں اس کو سمجھائیں۔ اس کی اصلاح کے لئے خدا سے دعا کریں۔ حتی کہ اگر وہ آپ کے کہنے پر اصلاح قبول نہ کرے تب بھی آپ کے لئے جائز نہیں کہ آپ اس کے خلاف تکفیر کا فتویٰ جاری کریں۔ مومن کا کام صرف نصیحت کرنا ہے۔ اس کے بعد بقیہ معاملات کا تعلق خدا سے ہے وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشش سے سرفراز کرے گا۔

تکفیر و تفسیق کا ہنگامہ صرف وہی شخص جاری کر سکتا ہے جس کا سینہ خدا کے خوف سے خالی ہو۔ جو آدمی خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو اس کا طریقہ ہمیشہ احتساب خویش کا ہوتا ہے نہ کہ احتساب غیر کا۔

جنتی کون

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ اپنے سچے بندوں کو اس جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان اس نے انھیں کرادی ہے (یدخلھم الجنة عرفھا لھم) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت کو جب جنت کے پھل دئے جائیں گے تو وہ کہیں گے۔ یہ تو وہی پھل ہے جو ہمیں دینا میں دئے گئے تھے۔ (ھذا الذی رزقنا من قبل) (محمد ٦)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنتی کون ہے۔ جنتی انسان وہ ہے جس نے دنیا ہی میں آخرت کا تجربہ کیا۔ جس نے آخرت میں خدا کو براہ راست دیکھنے سے پہلے اسی دنیا میں اس کو بالواسطہ طور پر دیکھا۔ جس نے اس بے پناہ شکر خداوندی کا دنیا ہی میں تجربہ کیا جو کسی آدمی کو اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ اپنے آپ کو جنت کے لطیف و نفیس دنیا کے اندر پائے گا۔ جس کے لئے خدا کی دنیا میں عاید کی جانے والی خدائی ذمہ داریاں اس طرح پر لذت بن گئیں جس طرح کسی کو آخرت میں ملنے والا انعام پر لذت معلوم ہوگا۔ جس نے دنیا ہی میں ان حقیقتوں کو معرفت کے درجہ میں پالیا جن کو پانے والے آخرت میں واقعہ کے درجہ میں پائیں گے۔

جنتی انسان وہ ہے جس نے کائنات کی وسعتوں میں جنت کی وسعتوں کو دیکھا۔ جس نے چڑیوں کے چہچہے میں جنت کی نغموں کو سنا۔ پانی کی ٹھنڈک جس کے لئے خدا کی رحمت بن کر اس کی رگوں میں اتر گئی۔ جس کا سینہ ان جذبات رحمت سے معمور ہو گیا جو جنت کے باشندوں کا خاصہ ہوگا۔

جنتی انسان وہ ہے جو دنیا میں اس مچھلی کی طرح رہا جس کو پانی سے نکال کر باہر ڈال دیا گیا ہو۔ جنتی انسان وہ ہے جو آخرت کی یاد میں اتنا زیادہ محو ہوا کہ دنیا کی لذتیں اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ جنتی انسان وہ ہے جو اس وقت بھی جنت میں تھا جب کہ ابھی وہ جنت سے باہر تھا، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اس نے اپنے تصورات میں جنت کو پایا تھا اور بعد کو وہ اپنے حقیقی تجربہ میں جنت کا ایک خوش نصیب باشندہ ہوگا۔

اختیارانہ عبادت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے ارادہ فرمایا کہ انسان کی صورت میں ایک بااختیار مخلوق پیدا کرے اور اس کو زمین پر بسائے۔ اس نے اپنے اس ارادہ کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا۔ فرشتوں نے یہ سن کر کہا کہ۔۔۔ کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ حالانکہ ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (البقرہ ۳۰)

خدا کو اپنی مخلوقات سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہی حمد و تقدیس ہے۔ یعنی خدا کی خدائی کا کامل اعتراف اور اس کی صفات کمال کا اعلیٰ اظہار۔ فرشتوں کو یہ اشکال ہوا کہ یہ مطلوب حمد و تقدیس تو ہم ہر لمحہ بیان کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی اور مخلوق کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت۔ مزید یہ کہ یہ نئی مخلوق کامل اختیار کی مالک ہو گی' ایسی حالت میں تقریباً یقینی ہے کہ وہ اپنے اختیار کا غلط استعمال کرے اور زمین کو خون اور فساد سے بھر دے۔

اللہ تعالی نے اس اشکال کی کھلی تردید نہیں کی۔ البتہ ذریت آدم کا از اول تا آخر تعارف کر کے بتایا کہ اس میں اگر فساد کرنے والے اور خون بہانے والے لوگ ہوں گے تو اس میں ابو بکر و عمر جیسے صالحین بھی ہوں گے۔ ایسے افراد اگر تھوڑے بھی نکلیں تب بھی وہ اس تخلیقی منصوبہ کی کامیابی کے لیے کافی ہیں۔ حمد و تقدیس فرشتوں سے بھی مطلوب ہے اور انسانوں سے بھی۔ مگر دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ فرشتوں کی حمد و تقدیس اگر مجبورانہ ہے تو انسان کی حمد و تقدیس اختیارانہ۔ اور دونوں میں ویسا ہی فرق ہے جیسا ریکارڈ کی ہوئی تقریر کو ٹیپ ریکارڈ پر بجانا اور ایک زندہ اور باشعور انسان کا اسٹیج پر بولنا۔

حمد و تقدیس کے جذبات سے سرشار ہونا' یہی اصل مطلوب ہے' فرشتوں سے مجبورانہ طور پر اور انسان سے اختیارانہ طور پر۔

نقصان نہیں

اسلام کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ ---لاضرر ولا ضرار فی الاسلام (ابن ماجہ، کتاب الاحکام) یعنی اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔ اس اصول کا تعلق انفرادی زندگی سے بھی ہے اور اجتماعی زندگی سے بھی۔

مومن اللہ سے ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ وہ کسی حال میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ مومن وہ ہے جو دوسرے کے درد کی چوٹ اپنے سینہ میں محسوس کرے۔ پھر ایسا انسان کیسے اس کا تحمل کر سکتا ہے کہ وہ کسی کو تکلیف پہنچائے۔ یا کسی کو اپنی طاقت کا نشانہ بنائے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کو کسی کے اوپر قدرت حاصل ہو جائے تب بھی وہ اس کو تکلیف پہنچا کر اپنی انانیت کی تسکین حاصل نہ کرے۔

مگر اسی کے ساتھ سومن اس کو بھی جانتا ہے کہ موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو خدا کی طرف سے پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ سرکش بن جاتے ہیں بہت سے لوگ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس دنیا میں جائز زندگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ایسے انسانوں کی طرف سے ہوشیار رہے جو اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ وہ دوسروں کو سینگ مار کر اپنی انا کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

اس قسم کے نقصان سے بچنے کے لئے مومن کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں، لوگوں سے لین دین کرنے میں، لوگوں کے درمیان رہنے میں وہ ہمیشہ چوکنا رہتا ہے تاکہ وہ دوسروں کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔

اس مقصد کیلئے مومن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے گرد قوت کا محسوس ہالہ بنائے رہے۔ تاکہ لوگ اس کی طرف سے ہیبت زدہ رہیں اور اس کے خلاف انھیں کسی شرارت کی ہمت نہ پڑے۔

ترکی کا سبق

بیسویں صدی کے آخر میں یورپ ایک نئی طاقت بن کر ابھرا ہے۔ یوروپین یونین کی صورت میں یہ برِ اعظم از سر نو متحد ہو گیا ہے۔ یورو کے نام سے یورپ کی ایک مشترک کرنسی وجود میں آئی ہے جو امریکی ڈالر کے اقتصادی غلبہ کو چیلنج کر رہی ہے وغیرہ۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ترکی یورپ ہی کا ایک جغرافی جزء ہے۔ اس کے باوجود وہ اس یورپی ترقی میں حصہ دار نہ بن سکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ترقی کے اس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا جو یوروپین یونین کا ممبر بننے کے لئے ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ترکی میں اصلاحی تحریکوں کا زبردست ہنگامہ جاری رہا ہے۔ پھر نصف صدی کی ہنگامہ خیز کوششوں کے باوجود یہ ناکامی کیوں۔ اس کا سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے۔ صحیح نقطۂ آغاز سے اپنا سفر شروع نہ کرنا۔

ترکی میں کئی سو سال سے طاقتور مسلم خلافت قائم تھی۔ مگر ہر کمالے را زوال کے اصول پر اس کو تنزل ہوا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر ترکی کی عثمانی خلافت اپنے آخری دور زوال میں پہنچ گئی۔ اس زوال کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ ان مسلمانوں کا دینی طبقہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ جدید دور کی ایک ریاست کی رہنمائی کر سکے۔ یورپ کے سائنسی اور فکری انقلاب نے زندگی کے تمام نقشوں کو بدل دیا تھا جب کہ ترکی کے علماء ابھی تک قدیم روایتی اور تقلیدی ڈھانچہ میں بند پڑے ہوئے تھے۔

اب ایک نیا طریقہ کار دریافت کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ طریقہ کار یہ تھا کہ علماء نئے حالات کی نسبت سے اپنی ناکافی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے پیچھے ہٹ جائیں۔ یعنی اقدام کے میدان سے ہٹ کر تیاری کے میدان میں آجائیں۔ وہ قوم کی تعلیم و تربیت کو اپنے ذمہ لے کر بقیہ میدان کو جمہوری عمل (democratic process) کے حوالہ کر دیں۔ جہاں تک مسجد اور

مدرسہ اور اس طرح کے دوسرے تعمیری اداروں کا معاملہ ہے وہ بھرپور طور پر اس کا انتظام سنبھال لیں۔ وہ اپنی ساری کوششوں کو اس ایک کام پر مرتکز کر دیں کہ انھیں ترکی کی مسلم قوم کو ازسر نو بیدار کرنا ہے۔ اس کے اندر پھر سے اسلامی اسپرٹ جگانا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اس مردہ زمین کو پھر سے زندہ کرنا ہے (الحدید ۱۷) تاکہ وہ دوبارہ اسلامی فصل اگانے کے قابل ہو جائے۔ اس کے بعد جہاں تک سیاسی اور حکومتی دائرہ کا تعلق ہے وہ اس کو جمہوری عمل پر چھوڑ دیں یعنی مقررہ مدت پر آزاد اور منصفانہ انتخاب ہو اور پھر اس انتخاب میں جو گروہ جیتے وہ دستور کے تحت مقرر مدت تک حکومت کا نظام چلائے۔

ترکی کے علماء اور رہنما اس عملی تقسیم پر اگر راضی ہو جاتے تو پچاس سال بعد آج ترکی دوبارہ ایک عظیم طاقت بن چکا ہوتا۔

مذکورہ معاملہ ان کے لئے پسپائی کا معاملہ نہ تھا بلکہ صرف وقتی قسم کی ایک عملی تدبیر کا معاملہ تھا۔ یہ گویا تیاری کا ایک وقفہ تھا جو انھیں اس قابل بنا دیتا کہ وہ آئندہ زیادہ موثر اقدام کر کے زندگی کے جدید نقشہ پر ازسر نو اسلام کی برتری قائم کر دیں۔ مگر ترکی کے دینی رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے اور ترکی غیر ضروری طور پر ایک تباہ کن داخلی ٹکراؤ کا شکار ہو کر رہ گیا جس کو عام طور پر اسلام ازم اور کمال ازم کا ٹکراؤ کہا جاتا ہے۔

بد قسمتی سے یہی واقعہ دوسرے اکثر مسلم ملکوں میں بھی پیش آیا۔ مثلاً مصر، شام، پاکستان، ایران، افغانستان وغیرہ۔ ان تمام مسلم ملکوں میں اسلامی انقلاب کے نام پر پر شور تحریکیں چلائی گئیں مگر نصف صدی کی خونی کوششوں کے باوجود کہیں بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ قطب ازم، خمینی ازم اور مودودی ازم بھی اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اسی طرح تباہ کن ثابت ہوا جس طرح کمال ازم۔ ان تباہیوں کا مشترک سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے حقائق پر مبنی طریق کار اختیار کرنے کے بجائے صرف جذبات کے زیر اثر اپنے کام کا نقشہ بنانا۔ نام نہاد اسلامسٹ گروہ نے جو نقصان پہنچایا وہ کمالسٹ گروہ سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ کمالسٹ گروہ نے جو

کچھ کیا وہ سیکولرزم کے نام پر کیا، اس لئے ان کے احمقانہ عمل سے جو بدنامی ہوئی وہ بھی سیکولرازم کے حصہ میں آئی۔ اس کے برعکس اسلامسٹ گروہ نے اپنی ساری تحریک اسلام کے نام پر چلائی اس لئے ان کی تحریک جب نقصان اور تباہی پر منتج ہوئی تو اس کی ساری ذمہ داری اسلام کے اوپر چلی گئی۔ کمالسٹ گروہ نے اگر غیر اسلام کو بدنام کیا تھا تو اسلامسٹ گروہ نے خود اسلام ہی کو سنگین طور پر بدنام کر ڈالا۔

اسلام کے نام پر کوئی تحریک چلانا انتہائی سنگین قسم کی ذمہ داری ہے اس لئے کہ اگر وہ تحریک درست نہ ہو یا وہ مہلک نتائج پیدا کرے تو اس کی ساری ذمہ داری اسلام کے سر پر چلی جائے گی۔ ایسے لوگ اپنے دعویٰ کے مطابق تو اسلام کے لئے اٹھیں گے مگر عملی نتیجہ کے اعتبار سے وہ صرف اسلام کو نقصان پہنچانے کا سبب بنیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ پچھلے زمانہ میں علماء اور صلحاء جو تحریکیں چلاتے تھے وہ اس معاملہ میں سخت احتیاط کرتے تھے۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کا ایک مظہر ہے کہ لوگ آئے دن ایک ہنگامہ کھڑا کرتے ہیں اور اس کا نام اسلام رکھ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج لوگوں کے دل خدا کے خوف سے خالی ہو گئے ہیں۔ خدا سے ڈرنے والے لوگ کبھی اس قسم کے ہنگامے کھڑا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ سب بے خوفی کی مثالیں ہیں نہ کہ خوف خدا کی مثالیں۔

ایک شخص وضو اور طہارت کی شرطوں کو پورا نہ کرے اور کھڑے ہو کر نماز کی ظاہری صورت کو دہرانے لگے تو اس کی نماز نماز نہ ہو گی، ایسی نماز پر کسی کو کوئی ثواب ملنے والا نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی تحریک یا اسلامی جہاد کا بھی ہے۔ اس کی بھی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کو پورا کئے بغیر اگر کوئی شخص اسلامی تحریک کے نام پر ایک ہنگامہ کھڑا کرے یا اسلامی جہاد کے نام پر توڑ پھوڑ شروع کر دے تو اس کا یہ عمل نہ اسلامی تحریک ہو گا اور نہ اسلامی جہاد۔

اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ایسے کسی عمل کا وہ مطلوب نتیجہ برآمد ہو جو اسلامی تحریک یا اسلامی جہاد کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

مثبت فکر

دور اول کے مسلمانوں نے جو بے نظیر کامیابی حاصل کی اس کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ ان میں کا ہر فرد مکمل معنوں میں مثبت سوچ (positive thinking) کا مالک تھا۔ وہ، قرآن کے مطابق عسر میں یسر کا پہلو تلاش کر لیتا تھا۔ وہ بظاہر شکست کے واقعہ میں فتح کا راز دریافت کر لیتا تھا۔ اس کے لئے پوری دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ مثبت خوراک کا دستر خوان بن گئی تھی۔ مسلمانوں کا یہی مزاج تقریباً ہزار سال تک جاری رہا۔ انیسویں صدی میں جب مسلم سلطنتیں اہل مغرب کے ہاتھوں ٹوٹ گئیں تو اس کے بعد جو مسلم رہنما اٹھے وہ رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہوں نے دور جدید کی مسلم نسلوں کو احتجاجی ذہن میں مبتلا کر دیا۔ ساری دنیا کے مسلمان، خواص اور عوام دونوں احساس محرومی (persecution complex) میں مبتلا ہو گئے۔ اس نازک تاریخی موقع پر مسلم رہنماؤں کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا گئے جس کو انگریزی میں پیرانوئیا (paranoia) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار کر لیں گے اور اگر وہ فلاح کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اختیار نہ کریں گے (الاعراف. ۱٤٦)

اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ لوگ منفی پکار کی طرف تیزی سے دوڑتے ہیں، مگر مثبت پکار کی طرف وہ اس طرح نہیں دوڑتے اس کا سبب یہ ہے کہ منفی کلام حال کی زبان میں ہوتا ہے اور مثبت کلام ہمیشہ مستقبل کی زبان میں، اور تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ مستقبل کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور حال کی زبان سمجھنے والے ہمیشہ بہت زیادہ۔

اس دنیا میں ہر قسم کی ناکامیوں کا راز منفی طرز فکر ہے اور ہر قسم کی کامیابی کا راز مثبت طرز فکر۔ منفی طرز فکر ہر قسم کی دینی اور اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے اور مثبت طرز فکر اس کے مقابلے میں ہر قسم کے دینی اور دنیوی خیر کا سرچشمہ۔

ترقی کا راز

مسٹر محمد حنیف (پیدائش ۱۹۵۱) دہلی میں رہتے ہیں۔ (Tel. 4690593) وہ کسٹم اینڈ سنٹرل اکسائز ڈپارٹمنٹ میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ وہ اپنے آفس میں اپنی اسلامی پہچان کو چھپاتے نہیں ہیں بلکہ ہر موقع پر قرآن اور اسلام کا تعارف بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کو ۱۹۹۹ کا صدارتی ایوارڈ (Presidential Award) دیا گیا جو ایک اعلیٰ سرکاری اعزاز سمجھا جاتا ہے۔

یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ۱۵ سالہ ریکارڈ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ امتیازی ایوارڈ کس کو دیا جائے۔ ہر سال محکمہ کے تین سینئر افسر متعلق شخص کی کارکردگی کا جائزہ لے کر اس کی رپورٹ لکھتے ہیں۔ اس طرح ۱۵ سال کے اندر ۴۵ افسران رپورٹنگ کے اس کام میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک افسر کی رپورٹ بھی اگر غیر موافق ہو تو وہ شخص اس قومی ایوارڈ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ کمیٹی کی طرف سے نامزدگی کے بعد یہ فائل مزید تقریباً نصف درجن سرکاری دفاتر میں کلیرینس کے لئے بھیجی جاتی ہے اور آخر کار وہ صدر جمہوریہ ہند کے پاس پہونچتی ہے۔

ہندستان کے ایک مسلمان کو اس غیر معمولی ایوارڈ کا استحقاق کیسے ملا۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے امتیازی کارکردگی اور خوش اخلاقی۔ اس معاملہ میں محمد حنیف صاحب کا ریکارڈ غیر معمولی طور پر ممتاز ہے۔ جہاں تک ان کے حسن اخلاق کا تعلق ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

۱۹۹۶ میں سویپرس کی بھرتی کے دوران ان کے آفس میں ایک اونچی ذات کا ہندو لڑکا انٹرویو کے لئے آیا۔ حنیف صاحب نے اس سے کہا کہ سویپرس کو نالی کی صفائی اور جھاڑو لگانے جیسا کام کرنا پڑتا ہے اور آپ کا تعلق ایک اونچی ذات سے ہے تو آپ یہ سارے کام کیسے کریں گے۔ اس نے جواب دیا کہ پیٹ کی خاطر میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ محمد حنیف

صاحب نے اس لڑکے کو وہ سروس دلا دی۔ لیکن محمد حنیف صاحب کو اس بات کا کافی احساس تھا لہذا انہوں نے اس کو نالی صاف کرنے اور جھاڑو لگانے کے بجائے دفتر میں ڈسٹنگ کے کام پر لگا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد محمد حنیف صاحب کا اس دفتر سے تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ ایک ہندو افسر آ گیا۔ اس کے بعد ایک دن اچانک وہ لڑکا محمد حنیف صاحب کے گھر آیا، اس نے بتایا کہ ہم کو دوبارہ نالی کی صفائی اور جھاڑو لگانے کا کام آپ کے جانے کے بعد دے دیا گیا ہے، جس سے آپ نے مجھے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ محمد حنیف صاحب کو اس کا ملال ہوا اور انہوں نے مذکورہ ہندو افسر سے ٹیلیفون پر اس لڑکے کے بارے میں بات کی اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ اس لڑکے کو نالی کی صفائی اور جھاڑو کے بجائے ڈسٹنگ کے کام پر ہی لگا رہنے دیں۔ محمد حنیف صاحب کے کہنے پر نئے افسر نے اس کو ڈسٹنگ کے کام پر بحال کر دیا۔

محمد حنیف صاحب اپنے دفتر میں ہر ایک کے ساتھ اسی طرح حسن سلوک کا معاملہ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹے ملازمین سے لے کر بڑے افسروں تک ہر آدمی ان کی عزت کرتا ہے۔

اسی طرح محمد حنیف صاحب اپنی سرکاری خدمات کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ سروس کے تحت ان کو بار بار مزید مالی فائدے حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر محمد حنیف صاحب اس قسم کی آمدنی سے مکمل طور پر دور رہتے ہیں۔ وہ اپنی جائز تنخواہ کے دائرہ میں زندگی گزارتے ہیں اور ناجائز آمدنی کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے۔

محمد حنیف صاحب کی اس قسم کی صفات ہی ان کا اصل سرمایہ ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جس نے ان کو مذکورہ قومی امتیاز کا مستحق بنایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں ایک مسلمان کے لئے ہر قسم کے اعلیٰ مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ کارکردگی کا طریقہ اپنا لے۔ اس کے بعد اس کو اپنے ماحول سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہوگی۔

مسئلہ یا چیلنج

مسائل زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ بے مسئلہ زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں اصل سوال خود مسئلہ کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیش آیا تو آپ نے اس کا مقابلہ کس طرح کیا۔

ایک مفکر نے کہا ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جو راستہ چل رہا ہے پھر اس کے راستہ میں چٹان آگئی۔ اب وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ وہ اس چٹان کو اپنے راستہ سے ہٹادے تاکہ اس کا سفر آگے کی طرف جاری ہو سکے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس کے راستہ میں چٹان آئی تو اس نے یہ کیا کہ وہ چٹان سے ہٹ کر دیکھنے لگا کہ کیا اس کے دائیں یا بائیں کوئی راستہ ہے جس پر چل کر وہ آگے بڑھ جائے اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھے۔ ان میں سے پہلا شخص ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور دوسرا شخص ہمیشہ کامیاب۔

مسئلہ کو صرف مسئلہ کے طور پر لینا گویا اپنے عمل کو اس میدان میں محدود رکھنا ہے جہاں مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی مسئلہ کو چیلنج کے روپ میں لے۔ ایسا آدمی مسئلہ کو نظر انداز کر کے اپنے عمل کے میدان کو بدل دیتا ہے۔ مسئلہ خواہ کتنا ہی سنگین ہو وہ آدمی کے لیے صرف ایک راستہ کو بند کرتا ہے جب کہ عین اسی وقت دوسرے بہت سے راستے اس کے لیے کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔

مسئلہ کو مسئلہ کے طور پر لینا گویا بند راستہ میں بے فائدہ طور پر اپنی کوشش کو ضائع کرنا ہے۔ اس کے برعکس مسئلہ کو چیلنج کے طور پر لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے ایک مقام پر راستہ کو بند دیکھ کر اپنا راستہ نہیں روکا بلکہ اس نے دوسرے کھلے ہوئے راستہ سے اپنی زندگی کا سفر شروع کر دیا۔

آپ طوفان کو روک نہیں سکتے 'البتہ اپنا گھر اس طرح بنا سکتے ہیں کہ جب طوفان آئے تو آپ اس کی زد سے محفوظ رہیں۔ یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ آپ مسائل کو دنیا سے ختم نہیں کر سکتے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ مسائل کے باوجود زندہ رہنا سیکھیں' آپ مسائل سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے لیے کامیابی کا راستہ نکال لیں۔

حسد کا نقصان

ابوالحسن علی سیف الدین آمدی ۵۵۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۳۱ھ میں وفات پائی۔ فقہ و اصول وغیرہ بغداد میں پڑھا۔ معقولات کی تحصیل شام میں کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ شام سے مصر گئے اور یہاں مدرسہ قرافہ میں نائب مدرس مقرر ہوئے۔ ان کے فضل و کمال کی شہرت روز بروز بڑھتی گئی لیکن یہی شہرت ان کے لئے مسئلہ بن گئی۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ان کی بڑھی ہوئی مقبولیت نے فقہاء وقت کو ان کا دشمن بنادیا یہاں تک کہ فقہاء نے ایک محضر تیار کیا جس میں ان پر بے دینی، الحاد، زندقہ، فلسفہ پرستی کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس محضر پر تمام فقہاء نے دستخط کئے۔ اور پھر اس کو خود علامہ آمدی کے پاس بھیجا کہ آپ بھی اس پر صاد کیجئے۔ علامہ موصوف نے اس پر یہ شعر لکھ دیا:

حسدوا الفتیٰ اذ لم ینالوا سعیه فالقوم اعداءٌ له و خصوم

انھوں نے جوان پر حسد کی جب کہ وہ اس کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ لوگ اس کے دشمن اور مخالف ہوگئے ہیں۔ (علم الکلام از علامہ شبلی نعمانی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۹۳، صفحہ ۸۰)

اس قسم کی عداوت اور مخالفت ہر بڑے شخص کو اپنے ہم زمانہ لوگوں کی طرف سے پیش آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کا اعتراف کرنا انھیں اپنے قد کو چھوٹا کرنے کے ہم معنی دکھائی دیتا ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کر کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا اعتراف کیا جائے۔ یہ نفسیات اتنی زیادہ بڑھتی ہے کہ لوگوں کو معاصر شخص میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ جب وہ شخص اس دنیا میں نہیں رہتا تو معاصرت اور رقابت کی نفسیات بھی ختم ہو جاتی ہے پھر دھیرے دھیرے لوگ اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

اعلیٰ انسان وہ ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگی سے پاک ہو۔ ایسا انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ مجرد سطح پر حقیقت کو دریافت کر سکے۔ جب کہ دوسری قسم کے انسان کسی حقیقت کو صرف

اس وقت دیکھ پاتے ہیں جب کہ وہ اس قدر واضح ہو چکی ہو کہ کسی شخص کے لئے اس کا انکار ممکن ہی نہ رہے۔

اس دنیا کا نظام امتحان کے اصول پر بنایا گیا ہے یہاں کی ہر چیز اسی امتحانی مصلحت کے تابع ہے۔ اس دنیا میں کوئی آدمی آپ سے چھوٹا ہوتا ہے اور کوئی آدمی آپ سے بڑا۔ یہ دونوں قسم کے آدمی آپ کے لئے یکساں طور پر امتحان کا پرچہ ہیں۔ وہ اس لئے ہیں تاکہ وہ آپ کی آزمائش بنیں۔ اگر آپ ان کے مقابلہ میں صحیح رویہ اختیار کریں تو آپ کو انعام دیا جائے اور اگر آپ غلط رویہ اختیار کریں تو آپ سزا کے مستحق قرار پائیں۔

آپ کا امتحان یہ ہے کہ جب آپ کا سابقہ ایسے آدمی سے پڑے جو آپ سے چھوٹا اور کم ہو تو آپ اس کی عزت کریں۔ آپ اس کو وہی انسانی مرتبہ دیں جو آپ اپنے لئے چاہتے ہیں چھوٹے آدمی کو عزت دینا اپنے آپ کو خدا کی نظر میں بڑا بنانا ہے۔

اسی طرح جو آدمی آپ سے بڑا یا زیادہ ہو اس کے مقابلہ میں آپ کا امتحان یہ ہے کہ آپ اس سے حسد نہ کریں آپ اس کے فضل و کمال پر جلن میں مبتلا نہ ہوں۔ بلکہ اس کو جو کچھ ملا ہے اسے خدا کا عطیہ سمجھیں۔ اس کی حیثیت کا دل سے اعتراف کریں اور اگر ضرورت ہو تو اس کا ساتھ دے کر خود بھی نیکی میں شریک ہو جائیں۔

کمتر آدمی کو بے عزت کرنا اور برتر آدمی سے حسد کرنا بظاہر دوسرے کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر اس کا نقصان خود اپنے آپ کو پہنچتا ہے۔ ایسا ہر رویہ خود اپنے خلاف ہے نہ کہ کسی دوسرے آدمی کے خلاف۔

مادی پہلو سے کسی کو اپنے سے چھوٹا پا کر اس کو حقیر سمجھنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے پرچۂ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی کو اپنے سے بڑا پا کر اس سے حسد کرے تو یہ بھی کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اس آدمی کو خدا نے جو امتحانی پرچہ دے کر آزمایا تھا اس میں وہ بری طرح ناکام ہو گیا۔

پیغمبر کی شخصیت

ہر انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک نفسیاتی وجود رکھتا ہے، اسی طرح پیغمبر اسلام بھی اپنی ابتدائی حیثیت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی وجود تھے۔ آپ انھیں جذبات اور احساسات کے ساتھ پیدا ہوئے جس طرح کوئی انسان پیدا ہوتا ہے۔ پھر آپ نے اپنے اس پیدائشی وجود کو ایک ربانی وجود میں تبدیل کیا۔ اس لحاظ سے پیغمبر اسلام کا نفسیاتی مطالعہ بے حد اہم ہے۔ اس طرح ایک عملی مثال کی صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پیدا ہونے والا انسان اپنی شخصیت کی تعمیر کس طرح اور کس رخ پر کرے، کس طرح وہ عام انسان سے بلند ہو کر اپنے آپ کو ایک ربانی انسان بنائے۔

ہمارا یہ مطالعہ ۶۱۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ مکہ میں آپ پر پہلی بار خدا کی وحی اتری۔ یہ آپ کے لئے ایک انوکھا روحانی تجربہ تھا۔ روایات میں آیا ہے کہ جب آپ کو فرشتہ کے ذریعہ خدا کا کلام ملا تو آپ پر دہشت طاری ہو گئی۔ آپ غار حرا سے نکل کر اپنے گھر واپس آئے۔ اور اپنی اہلیہ خدیجہ سے فرمایا کہ مجھ کو اڑھاؤ، مجھ کو اڑھاؤ۔ اس کے بعد آپ بستر پر لیٹ گئے۔ اور حضرت خدیجہ نے آپ کے اوپر چادر اڑھادی (فتح الباری ۱/۳۰)

پہلی وحی کے بعد پیغمبر اسلام پر یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی، اس کے بارے میں ابن حجر العسقلانی نے علماء کے بارہ اقوال نقل کئے ہیں (صفحہ ۳۳) مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ معاملہ احساس ذمہ داری کی بنا پر پیش آیا۔ نبوت کا مطلب یہ تھا کہ آپ اس زمانہ کے مشرک انسانوں کو توحید کا پیغام دیں۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اس کی مشکلات کے احساس نے آپ پر دہشت کی کیفیت طاری کر دی۔ آپ اس کام کی عظیم ذمہ داریوں کو سوچتے ہوئے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔

اس کے بعد قرآن کی سورہ نمبر ۷۳ (المزمل) اتری۔ اس سورہ میں آپ کو بتایا گیا کہ جو قول ثقیل (بھاری ذمہ داری) آپ پر نبوت کے ذریعہ ڈالی جا رہی ہے اس سے عہدہ بر آں ہونے

کے لئے آپ کو نماز سے مدد لینا چاہئے، نہ صرف عام نماز بلکہ تہجد کی نماز بھی جس کو قرآن میں نافلہ یعنی صلاۃ مزید کہا گیا ہے (الاسرا ۷۹)

یہ روداد اس معاملہ میں آپ کی نفسیاتی حالت کو بتاتی ہے۔ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے آپ کا نامزد کیا جانا بلا شبہ ایک عظیم ترین عہدہ پر آپ کو فائز کرنا تھا۔ عام انسان اس کو فضیلت کے روپ میں دیکھتے تھے۔ (المومنون ۲۴) لیکن پیغمبر اسلام نے اس نامزدگی کو فضیلت یا فخر کے طور پر نہیں لیا، بلکہ آپ نے اس کو تمام تر ذمہ داری کے معنی میں لیا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ذمہ داری کا پہلو آپ پر اتنا غالب آیا کہ آپ کو ادنیٰ درجہ میں بھی اس کا احساس نہیں ہوا کہ یہ فضیلت یا اعزاز کا معاملہ ہے۔

پیغمبر اسلام کی نسبت قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آپ ایک بشر تھے۔ آپ کا بشر ہونا آپ کی عظمت کو گھٹاتا نہیں بلکہ اس کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ آپ کی حقیقی عظمت کا راز یہ ہے کہ آپ پیدائش کے اعتبار سے ایک بشر تھے۔ مگر آپ نے اپنے غیر معمولی عمل سے فوق البشر جیسا کارنامہ انجام دیا۔

آپ پر محتاجی اور فراوانی دونوں قسم کے احوال گذرے مگر آپ ہر حال میں اعتدال پر قائم رہے۔ آپ کے خلاف لوگوں نے فوج کشی کی مگر جب وہ شکست کھا کر گرفتار ہوئے تو آپ نے انھیں یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ آپ کو ایک پورے ملک میں حکمراں کا درجہ ملا۔ مگر آپ نے ایک عام انسان جیسی زندگی گذاری۔ وغیرہ۔

کمال یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص پیدائشی طور پر عظیم پیدا ہو۔ کمال یہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ایک عام انسانی حیثیت سے پیدا ہو۔ مگر اپنے عمل سے وہ اپنے آپ کو عظمت کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دے۔

حیوانی زندگی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا وہ برت رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جیسے کہ چوپائے کھائیں، اور آگ ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ (محمد ۱۲)

انسان اور جانور حیاتیات کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔ دونوں کے درمیان حیاتیاتی پہلو سے کوئی حقیقی فرق نہیں۔ پھر وہ کیا چیز ہے جو حیوان کو حیوان بناتی ہے اور انسان کو انسان کا درجہ عطا کرتی ہے۔ یہ صرف ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ انسان کو جو اعلیٰ ذہنی صلاحیت ملی ہوئی ہے وہ حیوان کو حاصل نہیں۔

حیوان صرف اپنی مادی ضروریات کے دائرے میں سوچتا ہے۔ کھانا، پانی، تحفظ اور بقائے نسل جیسی سادہ ضرورتیں ہی اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی ضرورتوں سے اوپر اٹھ کر سوچنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ جبلت (انسٹنکٹ) سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے، وہ مادیات سے اوپر اٹھ کر جینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جو آدمی اپنی ذہنی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر استعمال کرے اور اپنے آپ کو ایک بلند تر مقصد حیات میں لگائے، وہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی مادی ضرورتوں کے دائرے میں محدود ہو کر رہ جائے، وہ صرف ایک حیوان کی مانند ہے۔ اس میں اور حیوان میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔

وہی انسان حقیقی انسان ہے جو اپنی سوچ اور اپنے کردار کے اعتبار سے اعلیٰ انسانی سطح پر زندگی گذارے۔ یہی وہ انسان ہے جس نے اپنے بارے میں خالق کے منصوبہ کو پورا کیا۔

کنورزن کا مسئلہ

اسلام اور کنورزن

اسلام کنورزن کی حمایت کرتا ہے۔ مگر اسلام کے نزدیک کنورزن رسمی مفہوم میں محض تبدیلی مذہب (proselytism) کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ذہنی انقلاب (intellectual revolution) یا روحانی تغیر (spiritual transformation) کے نتیجہ میں ایک شخص کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ یہ سادہ طور پر ایک مذہبی ڈھانچہ سے نکل کر دوسرے مذہبی ڈھانچہ میں جانا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی نے اپنی تلاش و تحقیق کے ذریعہ سچائی کو دریافت کیا۔ اور پھر اپنے ذاتی فیصلے کے تحت ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کر لیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۶ھ کے آخر میں اس زمانہ کے پڑوسی حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے تھے۔ ان خطوط میں ان کو اسلام قبول کرنے کی براہ راست طور پر دعوت دی گئی تھی۔ مثال کے طور پر آپ نے بازنطینی حکمراں ہرقل (Heraclius-1) کے نام دعوتی مکتوب روانہ کیا تو اس میں یہ الفاظ لکھے۔ "اسلم تسلم" (اسلام لاؤ تم سلامتی پاؤ گے) اسی طرح مکہ میں جہاں کہیں لوگوں کا مجمع ہوتا وہاں جا کر آپ فرماتے "ایھاالناس قولوا لا الہ الااللہ تفلحوا" (اے لوگو! کہو کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے)

یہ بظاہر لوگوں کو مذہب بدلنے کی دعوت تھی۔ مگر قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقۃً تبدیلیٔ فکر کی دعوت تھی نہ کہ سادہ طور پر محض مذہب بدل لینے کی۔ اسلام کے دور اول میں عرب کے کچھ دیہاتی لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے جب کہ ان کے اندر گہرے قسم کی کرداری تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان کے بارے میں قرآن میں یہ سخت آیت اتری۔ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کی،

اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (الحجرات ۱۴) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں کنورزن کا مطلب ایک انسان کی پوری زندگی کی تبدیلی ہے نہ کہ معروف معنوں میں صرف مذہب کی تبدیلی۔

اسی طرح قرآن میں یہود و نصاریٰ کے طریقہ پر نقد کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: کہو کہ ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کیا۔ اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں (البقرہ ۱۳۸) یہود و نصاریٰ کے یہاں مذہب بدلنے کا ایک رسمی طریقہ رائج تھا جس کو اصطباغ یا بپتسمہ (baptism) کہا جاتا ہے۔ اس رسم میں آدمی کو پانی میں غوطہ دیا جاتا تھا۔ وہ پانی کے رنگ کو پاکی کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی پیشوا کے ذریعہ صاف پانی میں غوطہ دینے سے ایک ناپاک آدمی پاک ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ نئے مذہب میں داخل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں کہا گیا کہ جسم کے اوپر ظاہری طور پر پانی ڈالنے سے کوئی شخص پاک نہیں ہوتا۔ پاکی یہ ہے کہ آدمی کی پوری شخصیت بدل جائے، اس کے اندر اللہ کا رنگ داخل ہو جائے، وہ اپنے قول و عمل میں پوری طرح خدائی طریقہ کو اختیار کر لے۔

اس معاملہ میں قرآن یہاں تک جاتا ہے کہ وہ رسمی تبدیلیٔ مذہب کی سرے سے تصدیق ہی نہیں کرتا۔ قدیم مدینہ میں تقریباً تین سو آدمی ایسے تھے جو اسلام کا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ بظاہر نماز روزہ بھی کرتے تھے مگر یہ سب کچھ انھوں نے اوپری طور پر یا منافقانہ طور پر کیا تھا۔ ان کی اندرونی حالت ان کے ظاہری اقرار کے موافق نہیں تھی۔ وہ زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے تھے مگر قلبی کیفیت کے اعتبار سے ان کے اندر اسلام کی اسپرٹ موجود نہ تھی۔ ایسے لوگوں کے اسلام کو قرآن میں جھوٹا اسلام کہا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ: جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ بیشک تم اس کے رسول ہو، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ (المنافقون۔۱)

قرآن کے مطابق تبدیلیٔ مذہب سے مراد کیا ہے۔ اس کا اندازہ چند آیتوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ایک واقعہ کا ذکر ہے جب کہ تقریباً ستر عیسائیوں کے ایک مجمع میں قرآن کی آیتیں پڑھی گئیں۔ اس کو سن کر وہ لوگ تڑپ اٹھے اور اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوگئے۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے: اور جب انھوں نے اس کلام کو سنا جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ (المائدہ ۸۳۔۸۴)

اسی طرح قرآن میں ایمان لانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لئے عزت کی روزی ہے۔ (الانفال ۲۔۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک تبدیلی مذہب حقیقت میں وہ ہے جو معرفت (realisation) کے نتیجہ میں پیش آئی ہو، جب کہ ایک انسان کی تلاش حق اپنی تلاش کا قابل یقین جواب پالے۔ یہ پانا اس کے لئے اتنا گہرا تجربہ ہو کہ اس کا دل تڑپ اٹھے۔ اس کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ اس کا پورا وجود اس سچائی کے رنگ میں ڈھل جائے۔ اس کے بعد وہ ایک نیا اور بالکل مختلف انسان بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کنورزن کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ

کنورزن کے معاملہ کو بتانے کے لئے دوسرے زیادہ بامعنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن جس دعوتی مشن کے تحت اتارا گیا ہے اس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے: بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک ظاہر کرنے والی کتاب آچکی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنی توفیق سے ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لارہا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ (المائدہ ۱۵۔۱۶)

اسی طرح جو لوگ قرآن کے مطالعہ سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوتے ہیں ان کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے: جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ حق ہے، کیا وہ اس کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو عقل والے لوگ ہی قبول کرتے ہیں (الرعد ۱۹) اس آیت کے مطابق، حقیقی کنورزن وہ ہے جو علم کی سطح پر واقع ہو، جس میں آدمی یہ محسوس کرتا ہو کہ وہ نہ جاننے کے مرحلہ سے نکل کر جاننے کے مرحلے میں داخل ہوا ہے۔ اسی لئے حدیث میں داخلۂ اسلام سے پہلے کے دور کو "جاہلیت" کہا گیا ہے، یعنی بے خبری کا دور۔

اسی طرح قرآن میں مومن اور غیر مومن کے فرق کو موت کے بعد زندگی پانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ: کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، اس سے نکلنے والا نہیں۔ (الانعام ۱۲۳)

اس حقیقت کو قرآن میں مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ زمین کی تمثیل کے ذریعہ اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو زرخیز زمین ہری بھری فصل سے لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح جن افراد کے دلوں میں استعداد ہے وہ سچائی کو پاکر جاگ اٹھتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے: اور جو زمین اچھی ہے اس کی پیداوار نکلتی ہے اس کے رب کے

حکم سے اور جو زمین خراب ہے اس کی پیداوار صرف ناقص نکلتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان کے لئے جو شکر والے ہیں۔ (الاعراف ۵۸)

اس بات کو قرآن میں ایک اور مقام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے۔ اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کوئی ثبات نہ ہو۔ اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ (ابراہیم ۲۴۔۲۷)

قرآن کی ان آیتوں میں اس فرق کو بتایا گیا ہے جو سچائی کو پائے ہوئے انسان اور سچائی کو نہ پائے ہوئے انسان کے درمیان ہوتا ہے۔ جو آدمی سچائی کو نہ پائے وہ گویا ایک ایسی جھاڑی کی مانند ہے جو زمین کے اوپر اگ آتی ہو۔ ایسی جھاڑی کچھ دن تک بے فائدہ طور پر زمین کے اوپر رہتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ یا تو خود مٹ جاتی ہے یا اکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک مفید اور پھل دار درخت زمین کے اوپر اس طرح اگتا ہے جیسے کہ وہ زمین کے لئے ہے اور زمین اس کے لئے۔ وہ زمین اور فضا سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہوئے خوب ترقی کرتا ہے۔ اس سے لوگوں کو ہر قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر ایک مطلوب اور بامعنی وجود کے طور پر کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کنورزن آفاقی اصول

اس معاملہ کا ایک پہلو اور ہے جس کی طرف قرآن میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ کنورزن کا معاملہ محدود طور پر صرف مذہب کی تبدیلی کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک آفاقی اصول ہے۔ موجودہ کائنات میں تمام ترقیاں اسی کنورزن کے طریقہ پر ظہور میں آئی ہیں۔

کائنات اپنی ابتدا میں ایک بند مادہ کی صورت میں تھی، پھر اس میں داخلی تغیر ہوا۔ یہ بند مادہ کھل کر پھیلنا شروع ہوا یہاں تک کہ موجودہ وسیع کائنات بن گئی۔ (الانبیاء۔ ۳۰) زمین سوکھی پڑی ہوئی ہوتی ہے پھر بارش کے ذریعہ اس میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ چٹیل میدان ہری بھری فصلوں اور شاداب درختوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (الحج ۵)

اسی طرح کچھ بظاہر غیر ذی روح اجزاء ایک مادہ کے بطن میں مخصوص تغیرات کے مراحل سے گزرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک مکمل قسم کے ذی روح وجود کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ چلتے پھرتے انسان اور چلتے پھرتے حیوان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے (الانعام ۹۶) اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گائے کے پیٹ میں گھاس اور دانا داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک قدرتی نظام کے تحت کچھ تغیراتی مراحل سے گذرتا ہے یہاں تک کہ وہ دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو انسان کے لئے ایک نہایت قیمتی غذا ہے۔ (النحل ۶۶) وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے قدرتی مظاہر کی مثال دے کر قرآن میں یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ یہ دنیا کنورزن کے عالمی اصول پر قائم ہے۔ یہاں ہر قسم کی ترقیاں ہمیشہ تغیراتی عمل (process) سے گذر کر وقوع میں آتی ہیں۔ ایک چیز اپنی ابتدائی حالت میں کچھ ہوتی ہے، اور پھر اس پر تغیر و تبدل کا عمل واقع ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ چیز ایک نئی بہتر چیز بن جاتی ہے..... دو قسم کے بادلوں کے ٹکراؤ سے نائٹروجن کا پیدا ہونا، دو قسم کی گیسوں کے ملنے سے پانی کا وجود میں آنا، خام لوہے کا متغیر ہو کر اسٹیل بن جانا۔ مختلف قسم کے کیمیکل کی آمیزش سے نئی نئی مفید دھاتوں کا بننا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب وسیع تر معنوں میں کنورزن کی مثالیں ہیں۔ یہی کنورزن انسانی افکار کی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ اس دنیا میں مسلسل طور پر افکار کے درمیان ٹکراؤ جاری ہے۔ اسی ٹکراؤ کے عمل سے ایک فکر بدل کر دوسرے بہتر فکر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں سینکڑوں سال تک شمسی نظام کے بارے میں زمین مرکزی نظریہ (geo-centric theory) کا

غلبہ تھا۔ پھر فکری تصادم کے نتیجہ میں اس میں تغیر شروع ہوا۔ یہاں تک کہ زمین مرکزی نظریہ کو علمی دنیا میں رد کر دیا گیا اور اس کی جگہ آفتاب مرکزی نظریہ (helio-centric theory) کو زیادہ صحیح قرار دے کر اس کو قبول کر لیا گیا وغیرہ۔

افکار کی دنیا میں اسی کنورزن کی ایک مثال وہ ہے جس کو مذہبی کنورزن کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مذہبی کنورزن فطرت کی وسیع تر اسکیم کا صرف ایک جزء ہے۔ یہ جزء بھی اتنا ہی مطلوب اور ضروری ہے جتنا کہ اس کا کل۔

حقیقت یہ ہے کہ کنورزن فطرت کا قائم کردہ ایک عالم گیر قانون ہے۔ مادی دنیا کی تمام ترقیاں اسی کنورزن کے اصول پر ہو رہی ہیں۔ زندہ اشیاء (انسان اور حیوان) کا جسمانی ارتقاء تمام تر اسی کنورزن کے اصول پر ہوتا ہے۔ اسی طرح افکار کی دنیا میں ہزاروں سال سے جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ سب کی سب اسی کنورزن کے اصول کو اختیار کرنے کی بنا پر ہو رہی ہیں۔ یعنی ایک چیز کو حق پاکر پوری طرح اختیار کر لینا۔ اس دنیا کا کوئی بھی ترقیاتی واقعہ اس کنورزن کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی معاملہ مذہب کا بھی ہے جو کہ روحانی سچائی کا دوسرا نام ہے۔ وہی مذہب کسی انسان کا مذہب بن سکتا ہے جس کو کسی آدمی نے ذاتی تلاش کے نتیجہ میں دریافت کیا ہو۔ مذہب کا نہایت گہرا تعلق یقین سے ہے اور یقین کا تعلق دریافت (discovery) سے۔ دریافت کے بغیر یقین نہیں، اور یقین کے بغیر مذہب نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر سچے مذہب کے ماحول میں پیدا ہو تب بھی وہ صرف آبائی تعلق کی بنا پر اس مذہب کو نہیں پا سکتا۔ مذہب کو بطور ایک یقینی صداقت کے پانا اس کے لئے صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ وہ خود اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ اس کو پائے، وہ ایک معلوم چیز کو دوبارہ دریافت (re-discover) کرے۔

کنورزن کی حقیقت

کنورزن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کچھ رسمی الفاظ ادا کرے۔ اور اپنا نام بدل کر ایک

کلچرل گروپ کو چھوڑ کر دوسرے کلچرل گروپ میں شامل ہو جائے۔ کنورزن کا مطلب تبدیلی مذہب نہیں بلکہ تبدیلی شخصیت ہے۔ کنورزن یہ ہے کہ ایک آدمی تلاش حقیقت میں سرگرم ہو۔ تحقیق و جستجو کے تمام مراحل سے گزرے اور پھر اس کے نتیجہ میں اس کے اندر ایک نئی شخصیت کا ارتقاء ہو۔ کنورزن اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نئی شخصیت کے ظہور کا نام ہے۔ ایسی ایک شخصیت کا بننا انسانی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ جب کسی سماج میں بڑی تعداد میں پیدا ہو جائیں تو وہ تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ ظہور میں لاتے ہیں۔

کنورزن در حقیقت ڈسکوری (دریافت) کے نتیجہ میں پیش آنے والا واقعہ ہے۔ ایک عظیم ڈسکوری کے بعد آدمی وہی نہیں رہتا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ اب وہ مکمل طور پر ایک نیا انسان ہوتا ہے۔ اسی قسم کی انقلابی تبدیلی کا نام کنورزن ہے۔ یہ تمام تر ذاتی فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ کسی خارجی لالچ یا دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کنورزن کا مطلب یہ ہے کہ ایک نہ پایا ہوا انسان پایا ہوا انسان بن جائے۔ ایک بے خبر انسان باخبری کے دور میں پہنچ جائے۔ ایک سویا ہوا انسان اپنے حواس کے ساتھ جاگ اٹھے۔ ایک شخص جو اندھے پن میں جی رہا تھا وہ بینا بن کر جینے کے قابل ہو جائے۔ ایک شخص جس کو اپنی کوششوں کا مرکز نہیں ملا تھا اس کو اپنی کوششوں کا ایک معلوم مرکز مل جائے۔ ایک شخص جو محدود دنیا میں جی رہا تھا وہ لامحدود دنیا میں داخل ہو کر سانس لینے لگے۔ ایک شخص جو صرف اپنے جسم کے دائرہ میں جی رہا تھا وہ اس سے اوپر اٹھ کر فکر کی اعلیٰ سطح پر جینے کا سامان کر لے۔ ایک شخص جو بے مقصد حالت میں بھٹک رہا تھا اس کو با مقصد زندگی کا راز معلوم ہو جائے۔

کنورزن ۔۔۔ ایک صحت مند تاریخی عمل

غالباً ۱۹۹۰ میں میں نے ایک ہندستانی رائٹر کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس کا نام کنورزن کی سیاست (Politics of Conversion) تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ اس کتاب سے مجھ کو صرف ایک اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ کتاب کا نام (ٹائٹل) درست نہیں۔ اس کا صحیح نام

ہونا چاہئے: کنورزن کو سیاسی بنانا (Politicisation of Conversion) یعنی ایک سادہ فطری حقیقت کو سیاسی رنگ دے کر اس میں غیر ضروری طور پر سنسنی خیزی پیدا کرنا۔

کنورزن کیا ہے۔ عام طور پر کنورزن کو مذہب بدلنے (proslytisation) کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ کنورزن اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنورزن فطرت کا ایک آفاقی قانون ہے۔ وہ ایک صحت مند تاریخی عمل ہے جو ناگزیر طور پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کنورزن کو روکنے کی کوشش کرنا گویا تاریخ کو روکنے کی کوشش کرنا ہے اور کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں کہ وہ تاریخ کے عمل کو روک سکے۔ کنورزن اپنی حقیقت کے اعتبار سے دو چیزوں کے ٹکراؤ سے ایک اور چیز کا پیدا ہونا ہے۔ یہ فطرت کا قائم کردہ ایک آفاقی قانون ہے جو خود اپنے زور پر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عمل اس کے اندر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کارل مارکس نے اس کو غلط طور پر جدلیاتی مادیت (dialectical materialism) سے تعبیر کیا تھا۔ زیادہ صحیح طور پر یہ ڈائیلاگ۔ کنورزن پر اسس ہے۔ یعنی جب دو فکری نظام کے درمیان بحث و تبادلہ ہوتا ہے تو اس کے بعد ایک فکری انقلاب برآمد ہوتا ہے۔

ڈائیلاگ۔ کنورزن پر اسس کا یہ عمل ہی تمام انسانی ترقیوں کا واحد زینہ ہے۔ جب بھی دنیا میں کوئی تہذیبی انقلاب آیا ہے یا کسی انسانی گروہ نے اٹھ کر کوئی تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ ہمیشہ اسی ڈائیلاگ۔ کنورزن پر اسس ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا ہے۔

اس عمل کی کوئی ایک صورت نہیں۔ یعنی یہ مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مذہبی بھی۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں اس کی دو بڑی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایک مذہبی کنورزن کی صورت میں اور دوسری سیکولر کنورزن کی صورت میں۔

عربوں کی تاریخ مذہبی کنورزن کی مثال ہے۔ چھٹی صدی عیسوی تک عرب ایک مشرکانہ نظام کے تحت محدود قبائلی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے بعد ساتویں صدی کے آغاز

میں اسلام یعنی دین توحید کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد دین شرک اور دین توحید کے درمیان زبردست ڈائیلاگ شروع ہوا۔ (بحث و مباحثہ) یہ ڈائیلاگ مزید شدت اختیار کر کے جارحانہ تصادم تک پہنچ گیا۔ اس ڈائیلاگ اور تصادم کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ عربوں کے اندر ایک نئی سوچ ابھری۔ بڑھتے بڑھتے وہ ایک عظیم فکری انقلاب بن گئی۔

اس ذہنی انقلاب یا اس فکر نو کی دریافت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے اندر ایک نئی شخصیت ابھری۔ ایک یورپی مورخ کے الفاظ میں، ان میں کا ایک ایک شخص اس طرح انقلابی شخصیت بنا کہ پوری قوم ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) بن گئی۔ ہیروؤں کی اس قوم نے صرف پچاس سال کے اندر وہ تاریخی واقعہ برپا کیا جس کو ایک مورخ نے (miracle of all miracles) معجزات کا معجزہ قرار دیا ہے۔ بریفالٹ نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ عربوں کے بغیر جدید مغربی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی۔

But for the Arabs, the western civilization would never have arisen at all.

دوسری مثال یورپ کی مسیحی قوموں کی ہے۔ صلیبی جنگوں (کروسیڈس) کے بعد کئی سو سال کے تاریخی عمل کے دوران یہاں بھی ایک کنورزن ہوا۔ یہ کنورزن مذہبی نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا سیکولر کنورزن تھا۔ چرچ اور سائنس کے درمیان زبردست مقابلہ پیش آیا۔ اس مقابلہ کی ایک روداد مندرجہ ذیل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے:

Conflict between Science and Religion

یہ مقابلہ ڈائیلاگ اور ٹکراؤ کی صورت میں کئی سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ یورپی قوموں کے اندر ایک نیا فکری انقلاب آیا جس میں انھوں نے قدیم کو چھوڑا اور جدید کو اختیار کر لیا۔ اس انقلاب کو عام طور پر نشاۃ ثانیہ (renaissanace) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس انقلاب نے یورپی قوموں کو اس قابل بنایا کہ وہ تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ انجام دے سکیں۔ وہ تاریخ انسانی کو روایتی دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچادیں۔ اصل یہ ہے کہ

انسان کا دماغ لامحدود طاقتوں کا ایک قدرتی خزانہ ہے۔ عام حالات میں یہ دماغ سویا ہوا رہتا ہے۔ یہ صرف خارجی جھٹکے ہیں جو اس کو بیدار کرتے ہیں۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ کا ایک عمل ہے۔ جتنا بڑا شاک ہو اتنا ہی بڑا ذہنی انقلاب انسان کے اندر پیدا ہوگا۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ انسان کے اندر وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کو نفسیات کے علماء دماغی طوفان (brain storming) کہتے ہیں۔ یہ دماغی طوفان آدمی کے اندر ایک نئی فکری تبدیلی، ایک نیا کنورزن وجود میں لاتا ہے۔ یہ کنورزن کسی قوم کے افراد کو ایک عام انسان سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے اور پھر وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کارنامہ انجام دے سکے۔

مذہبی کنورزن اس پورے عمل کا ایک چھوٹا سا جز ہے۔ تاہم جب ڈائیلاگ۔ کنورزن پر اسس چلتا ہے تو اس کو کسی حد کا پابند کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ لوگ فلاں فلاں قسم کا کنورزن کریں، اور مذہبی کنورزن نہ کریں۔ یہ ایک لامحدود سیلابی عمل ہے۔ اور سیلاب جب آتا ہے تو وہ کسی حد بندی کو قبول نہیں کرتا۔

جہاں تک مذہبی کنورزن کا تعلق ہے وہ صرف غیر مذہب کو قبول کرنے کے ہم معنی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی کنورزن کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک انرفیتھ کنورزن، دوسری انٹر فیتھ کنورزن۔ مثال کے طور پر سوامی وویکانند پہلے ایک ماڈرن قسم کے نریندر ناتھ تھے۔ پھر رام کرشنا پرم ہنس سے ان کا ذہنی ٹکراؤ ہوا جس کے بعد وہ سوامی وویکانند بن گئے۔ یہ داخلی کنورزن (انرفیتھ کنورزن) کی ایک مثال ہے۔

اس طرح اسی زمانہ کے ایک اور بنگالی ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے (وفات تاریخ) کا فکری تصادم مختلف مذاہب سے ہوا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے پہلے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک درجن بڑے بڑے مذاہب کا مطالعہ کیا۔ آخر میں وہ ایک فکری دریافت تک پہنچے۔ انھوں نے اپنے آبائی مذہب ہندوازم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنا نام عزیز الدین رکھا۔ انھوں نے اپنے اس فکری ارتقاء کی داستان ایک کتاب کی صورت میں لکھی ہے

جس کا نام یہ ہے:

Why I have Embraced Islam یہ انٹرفیتھ کنورزن کی ایک مثال ہے۔

یہ کنورزن کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہے۔ یہ دو طرفہ بلکہ کئی طرفہ طور پر چلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کچھ ہندوؤں نے اپنا مذہب بدل کر مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا ہے جب کہ یورپ اور امریکہ میں ہزاروں مسیحی اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو بن گئے۔ آج دنیا میں انگریزی میں نکلنے والا سب سے بڑا ہندو اخبار امریکہ سے نکلنے والا انڈیا ابراڈ (India Abroad) ہے۔ اور اس کا مالک اور اڈیٹر ایک ہندو کنورٹ ہے۔ انھوں نے مسیحیت کو چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کر لیا اور پھر یہ انٹرنیشنل اخبار نکالا۔

کسی قوم کو دوبارہ اٹھانے کے لئے عام طور پر تحریک احیا (revivalism) پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ یعنی قوم کے ماضی کو یاد دلا کر اس کو دوبارہ زندہ کرنا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس قسم کی احیائی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ تاریخ میں غالباً کوئی ایک بھی قابل ذکر مثال موجود نہیں جب کہ صرف احیاً ماضی کی تحریک کے ذریعہ کوئی قوم دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہو کر کھڑی ہو گئی ہو۔ اس کی ایک مثال ہندستان ہے۔ ہندستان میں ہندو قوم کو بیدار کرنے کے لئے پچھلے کئی سو سال سے مسلسل احیائی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس میں بہت بڑی بڑی شخصیتوں کے نام ہیں۔ راجہ رام موہن رائے، سوامی وویکانند، آروو ندو، مہاتما گاندھی وغیرہ۔ مگر لمبی مدت کی جدوجہد کے باوجود اس رخ پر ایک فی صد بھی کامیابی نہ ہو سکی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کا الٹا نتیجہ بر آمد ہوا۔

آزادی کے دور میں پہنچ کر ہندو سماج میں اخلاقی اقدار کا وہ نظام بھی باقی نہ رہا جو پہلے اس کے اندر پایا جاتا تھا۔ پہلے ایک جھوٹ بولنے پر یدھشتر کا اڑنے والا رتھ زمین پر گر پڑتا تھا، مگر آج کے یدھشتر صبح و شام جھوٹ بولتے ہیں اس کے باوجود ان کا رتھ نہایت تیزی کے ساتھ بلند فضاؤں میں اڑ رہا ہے۔ ماضی کے برعکس، آج کا ہندستانی سماج صرف ایک کرپشن (بھرشٹاچار) کا

سماج بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے اندر انقلابی روح کبھی بھی "ماضی کی طرف واپسی" سے نہیں پیدا ہوتی۔ یہ صرف جدید کی دریافت سے پیدا ہوتی ہے۔ انقلابی شخصیت کا ظہور قدیم کی طرف واپسی سے نہیں ہوتا بلکہ جدید کی طرف اقدام سے ہوتا ہے اور احیائی تحریک اپنی آخری تعریف کے مطابق صرف قدیم کی طرف واپسی کے ہم معنی ہے۔ وہ جدید کی دریافت یا جدید کی طرف اقدام کے ہم معنی بلاشبہ نہیں۔

سوامی وویکانند نے کہا تھا کہ ہندو قوم ورلڈ لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ مگر یہ انقلابی واقعہ "احیاءِ ماضی" جیسی کسی تحریک کے ذریعہ ظہور میں نہیں آسکتا جیسا کہ اب تک نہیں ہوا۔ ایسا واقعہ جب بھی پیش آئے گا وہ جدید کی دریافت یا نئے فکری انقلاب کے ذریعہ ہوگا۔ خواہ یہ فکری انقلاب مذہبی کنورزن کی صورت میں ہو یا سیکولر کنورزن کی صورت میں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ کنورزن کا یہ واقعہ صرف انفرادی سطح پر نہ ہو بلکہ عوامی سطح پر ہو۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی قوم کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکے اور تاریخ عالم میں اپنا نام روشن کرے۔

خلاصہ یہ کہ کنورزن محدود طور پر مذہبی تبدیلی کا معاملہ نہیں، یہ دریافت نو کا معاملہ ہے۔ اور نفسیات اور تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کو متحرک کرنے کے لئے نیز اس کے اندر اخلاقی انقلاب لانے کے لئے سب سے زیادہ جو چیز موثر ہوتی ہے وہ یہی دریافت (discovery) ہے۔ یہ احساس کہ میں نے ایک ایسی سچائی دریافت کی ہے جو اب تک مجھے معلوم نہ تھی انسان کی تمام سوئی ہوئی طاقتوں کو جگا دیتا ہے۔ وہ ایک عام انسان کی سطح سے اٹھ کر ایک ہیرو انسان بن جاتا ہے۔ اسی قسم کے ہیرو انسان ہیں جو سمندروں میں چھلانگ لگاتے ہیں، جو پہاڑوں کو پھاند جاتے ہیں، جو اپنے ہیروانہ کردار کے ذریعہ تاریخ کو نئے دور میں داخل کر دیتے ہیں۔ آج انسانی تاریخ دوبارہ ایک تعطل (deadlock) سے دوچار ہے۔ تاریخ کو دوبارہ انتظار ہے کہ کوئی قوم دریافت نو کے تجربہ سے گذرے۔ وہ نئی انسانی طاقتوں سے بھرپور ہو کر تاریخ انسانی کو وہ دھکا دے جو اس کو ایک نئے اور بہتر دور میں پہنچا دے۔

مراقبہ

مراقبہ کے لفظی معنی ہیں نگرانی کرنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ ھو رقیب نفسہ ، وہ اپنا نگراں آپ ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں مراقبہ کا مطلب ہے دھیان کرنا، تصور کی دنیا میں غرق ہو کر اپنا مراقب بن جانا۔

عام طور پر مراقبہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص لوگوں سے الگ ہو کر تنہائی میں بیٹھ جائے اور ذکر واذکار اور اوراد و وظائف میں مشغول ہو جائے۔ مگر یہ مراقبہ کا صرف ظاہری پہلو ہے، یہی کل مراقبہ نہیں۔ اصل مراقبہ اس سے زیادہ وسیع چیز کا نام ہے۔ اصل مراقبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ظاہری چیزوں سے ہٹا کر باطنی حقیقتوں کی طرف لے جایا جائے۔

یہ دنیا جس میں ہم جیتے ہیں وہ دو دنیاؤں کا مجموعہ ہے۔ چیزوں کی دنیا (world of things) اور معانی کی دنیا (world of meanings) ظاہر پسند اور مادہ پرست لوگ چیزوں کی دنیا میں اٹکے ہوئے رہتے ہیں، اس سے آگے کی انھیں کوئی خبر نہیں رہتی۔ لیکن گہری نگاہ والے لوگ اس سے اوپر اٹھ کر معنوی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں کا فرق ایک مثال سے واضح ہوتا ہے ۔

آپ کے سامنے ایک درخت ہے۔ آپ اس کو دیکھتے ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ آپ کی نظر اس کی ٹہنیوں، پتیوں اور پھولوں اور پھلوں تک محدود رہے۔ یہ ظاہری سوچ ہے۔ یہ مراقبہ والی سوچ نہیں۔ اس کے بجائے اگر پیڑ کو دیکھ کر آپ سوچنے لگیں اور آپ کی سوچ اس حقیقت تک پہنچے کہ پیڑ کے اندر ایک انوکھی صفت ہے کہ وہ آپ کی سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو فضا سے لے کر اپنی خوراک بناتا ہے اور اس کے بجائے آکسیجن آپ کی طرف لوٹاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ مضر گیس لے لیتا ہے اور اس کے بدلے میں مفید گیس آپ کی طرف واپس کرتا ہے۔

پہلی سوچ سطحی یا مادی سوچ ہے اور دوسری سوچ روحانی سوچ۔ پہلی سوچ والا درخت کو دیکھ کر صرف اس کے بعض ظاہری پہلوؤں کو پاتا ہے۔ مگر دوسری سوچ والا جب درخت کو دیکھتا

ہے تو اس پر معنوی اسرار کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اسی دوسری سوچ کا نام مراقبہ ہے۔ ایسے آدمی کے لئے درخت کو دیکھنا ایک عظیم روحانی ترقی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کے اندر یہ مزاج بنتا ہے کہ وہ بھی اس دنیا میں درخت کی طرح جیئے۔ اس کو دوسروں کی طرف سے نفرت ملے تب بھی وہ انھیں محبت کا تحفہ دے۔ دوسرے لوگ اسے ستائیں تب بھی وہ ان کا ہمدرد اور خیر خواہ بنا رہے۔

اسی طرح مثلاً ایک گائے ہے۔ ایک پولیٹکل آدمی اس کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آجاتا ہے کہ گائے کو اشو بنا کر وہ گائے کو مقدس سمجھنے والوں کی سیاسی حمایت حاصل کر سکتا ہے یا گائے کو اپنا انتخابی نشان بنا کر وہ ایک طبقہ کے اندر اپنا ووٹ بینک بنا سکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا آدمی وہ ہے جو گائے کو دیکھے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آجائے کہ گائے فطرت کی ایک انڈسٹری ہے۔ وہ گھاس کھاتی ہے اور اس کو دودھ میں کنورٹ کر کے ہماری طرف لوٹاتی ہے۔ پہلے آدمی نے گائے کے صرف ظاہر کو دیکھا تھا لیکن دوسرا آدمی گائے کی اندرونی حقیقت تک پہنچ گیا۔

اسی دوسرے طریقہ کا نام مراقبہ ہے۔ ایسے آدمی کے اندر یہ سوچ ابھرے گی کہ وہ بھی اپنے آپ کو خدا کی ایک انڈسٹری بنائے۔ اگر کوئی آدمی اسے گالی دے تو اس کے جواب میں وہ اس کو دعائیں دے۔ کوئی آدمی اس کے خلاف اشتعال انگیزی کرے تو وہ اس کے خلاف اعراض کا معاملہ کرے۔ کوئی شخص اس کے ساتھ برائی کرے تو وہ اس کو بھلائی کا تحفہ پیش کرے۔ اصلی مراقبہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے اوپر اٹھ جائے۔ وہ چیزوں میں نہ اٹکے بلکہ ان کے اندر چھپی ہوئی معنوی حقیقتوں کو دریافت کر لے۔ اسی کا نام روحانیت ہے۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ روحانیت ہو وہی حقیقی معنوں میں اس نعمت کو پاتے ہیں جس کو قلب کا سکون کہا جاتا ہے۔

مراقبہ اپنے آپ میں ڈوبنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا میں ڈوبنے کا نام ہے۔ حقیقی مراقبہ وہ ہے جب کہ ایک شخص اپنی ذات سے اور ساری دنیا سے اوپر اٹھ کر خدا میں غور و فکر کرنے لگے،

وہ مخلوقات میں گم ہونے کے بجائے خدا میں گم ہو جائے۔

اس قسم کا مراقبہ آدمی کو بے خود نہیں کرتا بلکہ وہ اس کو خود شناس اور خدا شناس بناتا ہے۔ مراقبہ اس کوشش کا نام ہے جب کہ انسان چھپے ہوئے روحانی تاروں کے ذریعہ خدا سے متصل ہو جائے۔ جب انائے صغیر انائے کبیر سے حسیاتی طور پر مربوط ہو جائے۔

انسان اور خدا کے درمیان یہ حسیاتی ربط ہی روحانیت کا اصل مقصود ہے۔ یہ حسیاتی ربط اس معنی میں نہیں ہوتا کہ انسان خدا میں مل جاتا ہے۔ یہ اتصال دراصل نفسیات کی سطح پر ہوتا ہے۔ انسان اپنے علیحدہ وجود کو باقی رکھتے ہوئے تصور کی سطح پر خدا سے قربت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ جسمانی اعتبار سے خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی وہ روحانی اعتبار سے خدا سے انتہائی حد تک قریب ہو جاتا ہے۔

مراقبہ کے لئے کسی تاریک گوشہ میں بیٹھنا ضروری نہیں۔ مراقبہ کا تجربہ ہر جگہ ہو سکتا ہے، حتی کہ ہجوم کے درمیان بھی۔ جب آدمی کا احساس بڑھا ہوا ہو تو کسی بھی تجربہ کے دوران ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا ربانی شعور جاگ اٹھتا ہے۔ وہ ظاہر میں باطن کا جلوہ دیکھ لیتا ہے۔ وہ مخلوق کے تجربہ میں خالق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ جب کسی پر یہ کیفیت گزرے تو گویا وہ مراقبہ کی حالت میں پہنچ گیا۔ اس نے سمندر کے ساحل پر رہتے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں اتر کر معرفت کا موتی حاصل کر لیا۔ مراقبہ دراصل تصور کی دنیا میں اپنے رب سے جڑ جانے کا دوسرا نام ہے۔ آدمی کا شعور جتنا زیادہ بیدار ہوا تنا ہی زیادہ اس کو مراقبہ کا تجربہ ہوگا۔ یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ہر لمحہ مراقبہ کی حالت میں پہنچ جائے (ڈاکٹر فریدہ خانم)

سوال

خدا کے وجود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو کائنات کو کون پیدا کرتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا (خوشونت سنگھ، دہلی)

جواب

یہ ایک غلط قیاس ہے۔ موجودہ زمانہ میں کائنات کے سائنسی مطالعہ سے یہ ثابت ہوا کہ کائنات خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتی۔ ضرورت ہے کہ کائنات کے باہر اس کا کوئی موجد یا خالق پایا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر بگ بینگ کا نظریہ یہی بتاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، کائنات ایک خارجی دھماکہ سے وجود میں آئی ہے۔ علمی اور عقلی طور پر دیکھا جائے تو ایسی حالت میں ہمارے لئے انتخاب (choice) باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے۔ بلکہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات میں ہے۔ چونکہ ہم مجبور ہیں کہ کائنات کو موجود مانیں، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو بھی مانیں۔ خدا کے وجود کو مان کر ہم کائنات کے وجود کی توجیہ پالیتے ہیں۔ جب کہ خدا کے وجود کو نہ ماننے کی صورت میں خود کائنات بلا توجیہ رہ جاتی ہے، اور علمی طور پر یہ توجیہ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

سوال

آپ دعوتی نقطۂ نظر سے ایک کام کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلم دشمن عناصر کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً جابجا مسلمانوں کی خامیوں کا ذکر کرنا وغیرہ۔ اس سے انھیں موقع ملتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو مطعون کر سکیں۔ آپ کو اس سے احتراض کرنا چاہئے۔ (خالد ندوی، دہلی)

جواب

الرسالہ کا مقصد خاص طور پر مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ اسی لئے میں الرسالہ کو ایک نصیحت نامہ کہتا ہوں۔ نصیحت کا یا اصلاح کا طریقہ کیا ہے اس کو جاننے کا واحد ذریعہ قرآن ہے۔ نصیحت یا اصلاح کے بارے میں قرآن کا جو اسلوب ہے وہی اسلوب میں نے اختیار کیا ہے۔ اور قرآن کا اسلوب اس معاملہ میں یہی ہے کہ جہاں کوئی داخلی کوتاہی نظر آئے اس کو کھلے طور پر ظاہر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مذکورہ

قسم کے اندیشے کا لحاظ کرنا قرآنی اسلوب کے سراسر خلاف ہے اور اسی لئے بے فائدہ بھی۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کے بعد دشمنوں کے ستر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ آئے۔ چند صحابہ (حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ) کی رائے یہ تھی کہ ان کے جنگی جرم کی بنا پر انھیں قتل کر دیا جائے۔ لیکن اکثر صحابہ بشمول حضرت ابو بکرؓ اور خود رسول اللہ ﷺ کی رائے یہ ہوئی کہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب اترا اور فرمایا گیا کہ ۔۔۔ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اللہ چاہتا ہے آخرت (الانفال ۶۷) یہ آیت بظاہر یہ بتاتی ہے کہ صحابہ کی اکثریت خدانخواستہ حب مال میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اگر نصیحت کا مذکورہ معیار درست ہو تو قرآن کو مسلمانوں کی اس کمزوری کا اس طرح اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا کیوں کہ اس طرح اغیار کو یہ کہنے کا موقع مل رہا تھا کہ تم لوگوں کی ساری جدوجہد مال کے لئے ہے۔ اس اندیشہ کے باوجود قرآن میں مذکورہ تنبیہ نازل کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے مطابق نصیحت کے معاملہ میں مذکورہ قسم کا اندیشہ سراسر غیر معتبر ہے۔ اس معاملہ میں حقیقت حال کو جیسا ہے ویسا ہی بیان کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اخفا کا طریقہ اختیار کرنا اگر مطلوب ہوتا تو قرآن میں مذکورہ آیت ہرگز نازل نہ ہوتی (اس طرح کی کئی اور مثالیں قرآن میں موجود ہیں)

سوال

آپ کہتے ہیں کہ اسلام کی پرامن تبلیغ ہونی چاہئے۔ مگر نبیوں کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہر نبی کو وقت کے اقتدار سے سنگھرش کرنا پڑا۔ ہمیشہ حق کو باطل سے مقابلہ آرائی کرنا پڑا اس لئے پرامن تبلیغ کس طرح ہو سکتی ہے (شکیل احمد، وردہ مہاراشٹر)

جواب

ہر نبی نے اقتدار کے خلاف جنگ کی ۔۔۔ یہ خود ساختہ مفروضہ ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ جنگ کا تعلق دعوت سے نہیں بلکہ دفاع سے ہے۔ ناگزیر حالات میں حسب استطاعت دفاع کیا جاتا ہے۔ کسی نبی کی تاریخ میں اگر جنگ کا واقعہ پیش آیا تو وہ جارحیت کے خلاف دفاع کے لئے تھا نہ کہ اپنے پیغام کی اشاعت کے لئے۔ اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ پیغمبر کا اپنے ہم عصر لوگوں سے جو ٹکراؤ پیش آیا وہ ایک زمانی چیز تھی۔ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا اس لئے ہر مذہب کو دوسرے مذہب کے مقابلہ

میں تشدد کا تجربہ پیش آتا تھا۔ مگر اب آزادی فکر کا زمانہ ہے۔ اب اظہارِ رائے کی آزادی کو ہر انسان کا لازمی حق سمجھا جاتا ہے اس لئے اب اگر صحیح اسلوب میں دعوت کا کام کیا جائے تو عملاً متشددانہ ردِ عمل پیش آنے کا کوئی امکان نہیں۔

سوال

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: کان حقا علینا نصر المومنین (الروم ۴۷) اس آیت کا ترجمہ حضرت شیخ الھند نے اس طرح کیا ہے: اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل اوقات میں خدا ضرور اہل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ حتی کہ وہ اس کو اپنے اوپر اہل ایمان کا حق سمجھتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں پچھلی کئی نسلوں سے مسلمان تقریباً ساری دنیا میں اغیار کی زیادتیوں کا مسلسل شکار ہو رہے ہیں مگر ان پر خدا کی وہ مدد نہیں آتی جو زیادتیوں کا یہ سلسلہ ختم کر دے اور مسلمانوں کو دوبارہ سربلند کر دے اور اس طرح ہمارے اوپر خدا کا وعدہ پورا ہو۔ (عبد الرحیم امدادی، مرشد آباد)

جواب

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ بلاشبہ برحق ہے۔ مگر اس آیت میں مومنین کے لفظ سے مراد عمومی مفہوم میں مسلم ملت یا مسلم قوم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو خدا کے اس مطلوب مشن کو لے کر اٹھیں جس کو رسول اللہ کے زمانہ کے اہل ایمان لے کر اٹھے تھے۔ اور اس میں اپنی جان و مال کی قربانی دی تھی۔ جب اہل ایمان کا کوئی گروہ اس قسم کا ربانی مشن لے کر اٹھے اور کچھ لوگ اس کو چیلنج کریں تو ان کا یہ چیلنج خود خدا کے خلاف چیلنج کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی مخالفانہ کارروائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کے خلاف ہوتی ہے نہ کہ محض اہل ایمان کے خلاف۔ یہی وجہ ہے کہ خدا ایسے اہل ایمان کی مدد پر آجاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی ان مقابلہ آرائیوں میں خواہ اسلام کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے، ہر حال میں وہ مسلمانوں کی اپنی قومی یا سیاسی لڑائیاں ہیں۔ خدا کا مذکورہ وعدہ موجودہ قسم کی قومی لڑائیوں پر نہیں ہے بلکہ وہ اصحاب رسول جیسی خالص دینی جدوجہد کے اوپر ہے۔ یہ معاملہ

قرآن کی آیتوں میں بالکل واضح ہے مثال کے طور پر فرمایا کہ " ان تنصرو الله ینصر کم" (محمد. ۷) یعنی اگر تم اللہ والا کام کرنے کے لئے اٹھو گے تو اللہ تمہاری مدد کر کے تم کو کامیاب بنائے گا۔ اس سے واضح ہے کہ مدد کا وعدہ اللہ والے کام پر ہے نہ کہ مسلمانوں کے اپنے قومی کاموں پر۔

سوال

کیا آپ اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ ہندوؤں ہی کی طرح انگریز بھی ہمارے مدعو تھے۔ آخر ان کو ملک سے نکال باہر کرنے کی تحریک کس دعوتی جذبے کے تحت درست قرار دی جاسکتی ہے۔ غالباً آپ اس پر اس لئے تنقید نہیں کرتے کہ یہ ایک ناگزیر تاریخی عمل تھا۔ میرے نزدیک یہی اصول تحریک پاکستان کے معاملہ میں بھی کار فرما ہے (طالب محسن، لاہور)

جواب

ہندستان میں ملکی آزادی کی جو تحریک چلائی گئی اس میں اگرچہ علما بڑی تعداد میں شریک تھے۔ مگر میں اس کو کوئی اسلامی تحریک نہیں سمجھتا۔ اور نہ اس کے لئے جہادِ آزادی کے لفظ کا استعمال شرعاً درست سمجھتا ہوں۔ یہ بات میں نے بار بار الرسالہ میں اور اپنی کتابوں میں لکھی ہے۔ میرے نزدیک آزادی کی یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اور اسی اعتبار سے اس کا جواز ہے۔ اگر پاکستان کی تحریک کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ وہ ایک قومی تحریک تھی نہ کہ کوئی اسلامی تحریک تو اس کے بارے میں بھی میری رائے مختلف ہو جائیگی۔ میں نے بار بار لکھا ہے کہ جن علما نے انگریزوں کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریک چلائی انھیں انگریزوں کے معاملہ میں دعوتی تحریک چلانا چاہئے تھا۔ اسی طرح جن مسلم رہنماؤں نے ہندو مسئلہ کے خلاف علیحدہ پاکستان کی تحریک چلائی، ان کے لئے بھی زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں دعوت کی تحریک چلاتے۔ میری ایک ہی رائے دونوں قسم کے مسلم رہنماؤں کے بارے میں ہے۔

سوال

آپ کہتے ہیں کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ مگر قرآن میں اس کا بالکل الٹا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ ان کو مارو۔ قرآن اسلام کی مقدس کتاب ہے۔ پھر اسلام امن کا مذہب کیسے ہو سکتا ہے (بیکنٹھ لال شرما پریم، نئی دہلی)

جواب

قرآن میں جہاں قاتلوا المشرکین کا حکم آیا ہے، وہ عام معنی میں نہیں ہے، بلکہ خاص معنی میں ہے۔ یعنی اس سے مراد ساری دنیا اور ہر زمانہ کے مشرکین نہیں ہیں بلکہ پیغمبر اسلام کے معاصر مشرکین ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو پیغمبر اسلام کے خلاف جارحیت کر رہے تھے۔ جنھوں نے آپ کے خلاف یک طرفہ طور پر جنگ چھیڑ دی تھی۔ ان سے دفاع کے طور پر لڑنے کا حکم دیا گیا۔

اسلام میں صرف ایک ہی جائز جنگ ہے اور وہ دفاع کی جنگ ہے۔ اس کے سوا کوئی اور جنگ اسلام میں جائز نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "فکر اسلامی")

قرآن میں قتال کے حکم کو آپ گیتا کے تقابلی مقابلہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ گیتا ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب ہے۔ اس میں کرشن جی ارجن کو لڑنے پر ابھارتے ہیں۔ وہ ارجن سے کہتے ہیں کہ تم یدھ کے لئے آگے بڑھو۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ گیتا اپنے ماننے والوں سے کہتی ہے کہ تم لوگ ہمیشہ اور ہر جگہ دوسری قوموں سے لڑتے رہو۔ تم ہر ایک کے خلاف مار کاٹ کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ گیتا میں کرشن جی کی جنگی تلقین وقتی معنی میں ہے نہ کہ ابدی معنی میں۔ یعنی تمہارے سامنے جو اپنائی لوگ ہیں ان سے لڑو۔ انھیں پر یہ جنگ شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح قرآن میں جس جنگ کا حکم ہے وہ پیغمبر کے زمانے کے ایک جارح گروہ کے خلاف تھی۔ یہ جنگ انھیں پر شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہو گئی۔ بعد کے زمانہ میں اس کا حکم اگر باقی ہے تو صرف جارحیت کرنے والوں کے مقابلہ میں دفاع کے لئے ہے نہ کہ عمومی طور پر لوگوں سے لڑنے مرنے کے لئے۔

ایک انٹرویو

آسٹریلین براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ساؤتھ ایشیا بیورو کے چیف مسٹر جانیتھن ہارلے (Jonathan Harley) نے ۲۲ فروری ۱۹۹۹ کو راقم الحروف کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں دہلی میں تھا۔ پھر میں حال میں لاہور گیا تاکہ وہاں ہندستانی وزیر اعظم اور پاکستانی وزیر اعظم کی "بس ڈپلومیسی" (۲۰۔۲۱ فروری) کور کر سکوں۔ ایک بات میں نے ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ کے مسلمانوں میں دیکھی۔ یہاں کے مسلمان یہ مانگ کر رہے ہیں کہ سلمان رشدی (مصنف سیٹنک ورسز) کو ہندستان آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اسی طرح پاکستان کے مسلمان وہاں یہ مانگ کر رہے تھے کہ اٹل بہاری واجپئی (ہندستانی وزیر اعظم) کو پاکستان آنے سے روکا جائے۔ اور جب گورنمنٹ کے انتظام کے تحت اٹل بہاری واجپئی وہاں پہنچ گئے تو پاکستانی مسلمانوں نے یہ نعرہ لگایا کہ "اٹل بہاری گو بیک"۔ ان مسلمانوں نے ایسا کیوں کیا۔ کیا اس طرح کے معاملہ میں اسلام کی تعلیم یہی ہے۔

میں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے مسلمانوں کا یہ مطالبہ محض ان کی جذباتی سیاست کا نتیجہ تھا، نہ کہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ۔ اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم مسلمانوں کی اس روش کے بالکل برعکس ہے۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے، اور تبلیغی مذہب کسی غیر مسلم کو مدعو کی نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ دشمن یا حریف کی نظر سے، حتی کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دشمن کو بھی امکانی دوست کے روپ میں دیکھو کیونکہ تمہارا حسن عمل اس کو بدل کر تمہارا دوست بنا سکتا ہے (حم السجدہ ۳٤)

مذکورہ قسم کے معاملہ میں اسلام کی تعلیم کیا ہے، وہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتّٰی یسمع کلم الله ثم ابلغه مأمنه ذالك بانهم قوم لا یعلمون (التوبه ٦)

(اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے جوار مانگے تو تم اس کو جوار دے دو تا کہ وہ اللہ کے کلام کو سنے پھر اس کو اس کے مامن میں پہنچادو۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے)

عمومی حکم کے اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم یا بظاہر مخالف اسلام گروہ کا کوئی فرد مسلم علاقہ میں آنا چاہے تو تم اس کو وہاں بلا روک ٹوک آنے دو۔ اس طرح اس کو یہ موقع ملے گا کہ وہ اسلام کے پیغام کو جانے اور اسلام کے بارے میں اس کی بے علمی ختم ہو جائے:

If a non Muslim seeks a visit to your place let him come to you so that he may hear the word of God. And then arrange for his safe retrurn to his home.

اس قرآنی تعلیم کا تقاضہ ہے کہ جب بھی کوئی "غیر شخص" مسلمانوں کے علاقہ میں آنا چاہے تو اس کی آمد کو روکنے کی مہم نہ چلائی جائے اس کے بجائے انہیں یہ کرنا چاہئے کہ وہ اسے خدا کے پیغام سے آشنا کرنے پر ساری طاقت خرچ کریں۔ وہ سیٹنگ ورسز کے جواب میں ہولی ورسز (Holy Verses) تیار کر کے شائع کریں۔ وہ ہندو ایجنڈا کے بجائے اسلامی ایجنڈا کی معنویت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

صحیح اسلامی ذہن یہ ہے کہ اس طرح کے مواقع کو ایک امکان (Opportunity) کے روپ میں دیکھا جائے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کیا جائے۔ موجودہ زمانہ پریس اور میڈیا کا زمانہ ہے۔ پریس اور میڈیا، اپنے مزاج کے مطابق، ایسے موقع پر ہر چیز چھاپنے اور مشتہر کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس لئے ایسے موقع کو اگر منظم طور پر اسلام کے تعارف کے لئے استعمال کیا جائے تو پریس اور میڈیا کے پورے نظام کو اس مقصد کے لئے اپنا زبردست معاون بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام کا طریقہ

مکی دور کے ابتدائی زمانہ میں عمر بن الخطاب اسلام کے سخت مخالف بنے ہوئے تھے۔ حتی کہ ایک روز وہ اپنے گھر سے تلوار لے کر نکلے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کا خاتمہ کر دیں۔ راستہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے ان کے دل کو نرم کر دیا اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔ اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مکہ میں اسلام کی سخت مخالفت ہو رہی تھی اور حالات بے حد شدید ہو گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ صفا پہاڑی کے پاس اپنے کچھ اصحاب کے ساتھ ایک مکان میں مقیم تھے جس کو دار ارقم کہا جاتا تھا۔ ایک صحابی خباب کے ذریعہ عمر بن الخطاب کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ صفا کے قریب ایک گھر میں ہیں۔ وہ صفا کی طرف روانہ ہو گئے۔ حسب معمول ان کے کندھے پر ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب ان کی آواز سنی تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب کھڑے ہو گئے۔ اور دروازے کی دراز میں سے انھیں دیکھا کہ تلوار لئے ہوئے باہر کھڑے ہیں۔ وہ گھبرائے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹے۔ یہ عمر بن الخطاب ہیں اور تلوار لئے ہوئے ہیں۔ حمزہ بن عبد المطلب نے کہا: ان کو آنے کی اجازت دیجئے۔ اگر وہ بھلائی کے ارادے سے آئے ہیں تو ہم ان کے ساتھ بھلائی ہی کا سلوک کریں گے۔ اور اگر وہ کسی برائی کے ارادے سے آئے ہیں تو ہم ان کو انہی کی تلوار سے قتل کر دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ائذن له." انھیں آنے دو۔ اس شخص نے آنے کی اجازت سنائی۔ رسول اللہ ﷺ اٹھ کر ان کی طرف چلے۔ ان کے پاس پہنچ کر ان کی چادر کو پکڑ لیا اور ان سے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، تم کو کیا چیز یہاں لائی ہے؟ خدا کی قسم میں نہیں سمجھتا کہ تم باز آؤ گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی آفت تمہارے اوپر نازل فرمائے۔

عمر نے کہا: اے خدا کے رسول! میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اللہ، اس کے

رسول اور اس چیز پر ایمان لاؤں جو اللہ کے پاس سے آپ لائے ہیں۔ راوی نے کہا: اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس زور سے تکبیر کہی کہ جو اصحاب گھر میں موجود تھے وہ جان گئے کہ عمر نے اسلام قبول کر لیا (سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الاول۔ ۶۸۔ ۳۶۷)

دور اول کا یہ واقعہ ایک رہنما واقعہ ہے۔ اس واقعہ سے کئی نہایت اہم سبق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سبق مختصر طور پر یہ ہیں۔

پہلی بات یہ کہ کوئی شخص اگر مسلمانوں کے پاس آنا چاہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو بے روک ٹوک آنے کی اجازت دیں۔ خواہ آنے والا قلم لے کر آنے والا ہو یا تلوار لے کر۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی نظر خود اپنے دین کی تسخیری طاقت پر ہونا چاہئے نہ کہ دشمن کی دشمنی پر۔

دوسری بات ہے۔ ان کے بارے میں ہمیشہ پر امید رہنا، خواہ بظاہر وہ اسلام اور اہل اسلام کا مخالف ہی کیوں نہ بنا ہوا ہو۔ عمر بن الخطاب اس وقت اسلام کے بارے میں اتنے شدید تھے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "فوالله ما أرى أن تنتهي حتى ينزل الله بك قارعة" (۳۶۸) اس کے باوجود اسلام کی فطری صداقت نے عمر کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔

تیسری بات حضرت حمزہ کے قول سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اس کے حربہ سے اسی کو شکست دینا (قتلناه بسيفه) اس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والا جس طاقت سے مسلح ہو کر آرہا ہے اسی طاقت کو اس کے خلاف استعمال کیا جانا چاہئے۔ موجودہ زمانہ میں قلم نے تلوار کی جگہ لے لی ہے۔ آج کا حریف علم اور قلم کے ذریعہ اسلام پر وار کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ علم اور قلم کے میدان میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ تیار کریں تاکہ وہ فریق ثانی کے اپنے ہی میدان میں اس کو شکست دے سکیں۔

۱۔ ۵نومبر ۱۹۹۸کو لوک نیتی کے زیر انتظام بھائی ویر سنگھ سدن (گول مارکیٹ نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا جس کا موضوع جمہوریت اور مذہبیت (religiosity and democracy) تھا۔اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ایک مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تبلیغ (preaching) کے راستہ میں جو رکاوٹ ڈالے اس سے جنگ کرو۔اس سلسلہ میں بتایا گیا کہ یہ اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ تبلیغ مکمل طور پر ایک پرامن عمل ہے۔ تبلیغ اسی دائرہ میں کی جائے گی جس دائرہ میں نظام اس کی اجازت دیتا ہو۔ مثلاً مکہ کے ابتدائی دور میں علانیہ تبلیغ کی صورت میں وقت کے نظام سے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا تو پیغمبر اسلام نے خفیہ انداز میں تبلیغ کی۔اسلام میں جنگ صرف دفاع کے لئے ہے۔ایک اور سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ مہاتما گاندھی، جے پرکاش نرائن اور آیات اللہ خمینی جو تبدیلی لائے وہ ریولیوشن نہیں تھا۔بلکہ کو (coupe) تھا۔اس میں صرف سیاسی ٹیم بدلی۔اور سماجی حالت میں کوئی حقیقی انقلاب نہیں آیا۔ایک ہندو جرنلسٹ نے کہا کہ یہ مہاتما گاندھی کے ریولیوشن کو گھٹا کر بتانا ہے۔ مہاتما گاندھی کا ریولیوشن پراسس کی صورت میں سماجی بدلاؤ لا رہا ہے۔ کہا گیا کہ یہ اگر پراسس ہے تو وہ الٹے رخ (reverse direction) میں جاری ہے۔ کیونکہ ۱۹۴۷سے پہلے ہمارے ملک میں ایک فیصد کرپشن تھا تو آج ۱۰۰فیصد کرپشن ہے۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ گاندھی ریولیوشن کا یہ رزلٹ ۵۰سال بعد بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

۲۔ بی بی سی (نئی دہلی) کے تحت ۳دسمبر ۱۹۹۸کو ایک پینل ڈسکشن ریکارڈ کیا گیا جو ۵دسمبر کی رات کو نشر کیا گیا۔اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں حصہ لیا۔اس کا موضوع

تھا: نئے ہندستان میں مسلمانوں کے مسائل۔ اس موضوع پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ بابری مسجد کا مسئلہ علماء کے ایک بورڈ کے ذریعہ طے کیا جانا چاہئے۔ زور زبردستی کے ذریعہ کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ زور زبردستی کے ذریعہ جو مسئلہ حل کیا جائے گا وہ نئے نئے مسائل پیدا کر کے معاملہ کو اور زیادہ سنگین بنا دیتا ہے۔

۳۔ لاس اینجلس ٹائمس کے نئی دہلی بیورو چیف مٹر ڈکسٹر فلکنس (Dexter Filkins) نے ۹ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق بعض اسلامی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ میوزک کو اسلام میں حرام نہیں کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ شرطیں ہیں مثلاً غیر اخلاقی میوزک جائز نہیں۔ البتہ روحانی میوزک جائز کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صوفیاء کے یہاں قوالی کی صورت میں اس کا رواج رہا ہے۔

۴۔ دوردرشن (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۵ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق بابری مسجد جیسے مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسائل صرف ہندستان کی خصوصیت نہیں ہیں بلکہ مسائل ہر جگہ پیدا ہوتے ہیں۔ مسلم ملکوں میں بھی اسی طرح مسائل ہیں جس طرح ہندستان میں مسائل ہیں۔ مسائل کا حل ہمیشہ حکیمانہ تدبیر ہوتا ہے نہ کہ شور وغل۔

۵۔ ہندی ہفتہ وار جن چیتنا کے ایڈیٹر مسٹر رام گوپال سسوڈیا (دہلی) نے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے دینی مدارس اور ملک کے سکولر اسکولوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

بنگلور کے انگریزی ہفتہ روزہ ایمی ننس (Eminence) کے نمائندہ مسٹر انور علی نے ۲۹ دسمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلم فنڈ منٹلزم جیسی کوئی چیز انڈیا میں نہیں۔ بعض مسلم ملکوں میں ضرور فنڈ منٹلسٹ گروپ پائے جاتے ہیں مگر جہاں تک انڈیا کا تعلق ہے یہاں کوئی قابل ذکر مسلم فنڈ منٹلسٹ گروپ نہیں۔ بعض افراد پائے جاتے ہوں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

۶۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۸ کو دہلی کے ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ اسلام بلاشبہ حب الوطنی کی تعلیم دیتا ہے۔ البتہ اسلام میں وطن کی پرستش کی تعلیم نہیں۔ وطن کی پرستش کچھ لوگوں کا مذہبی عقیدہ ہو سکتا ہے، مگر یہ حب وطن کی کوئی شرط نہیں۔

۷۔ ۹ دسمبر ۱۹۹۸ کو پروٹسٹنٹ چرچ نئی دہلی میں ایک جلسہ ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے بھی اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فرق اور اختلاف کے باوجود ہر ایک کا احترام کرو۔ ہر ایک کو اس کے اخلاقی اور انسانی حقوق ادا کرو۔ حدیث رسول کی روشنی میں اس کو واضح کیا گیا۔

۸ آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) میں ۲ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ اس میں پروفیسر مدھوڈنڈوتی اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ ہمارے دیش کی پہچان کیریکٹر ہے۔ دوسری بات یہ کہ کیرکٹر کی تعمیر ایجوکیشن کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مجبورانہ کیریکٹر حکومت کے زور پر بھی لایا جاسکتا ہے مگر وہ غیر مفید ہے۔ اصل ضرورت سلف ڈسپلن کی ہے اور سلف ڈسپلن صرف ایجوکیشن کے ذریعہ آسکتا ہے۔

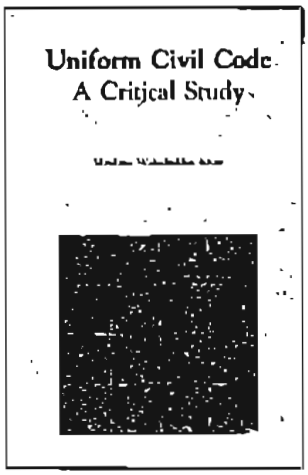
Uniform Civil Code
A Critical Study

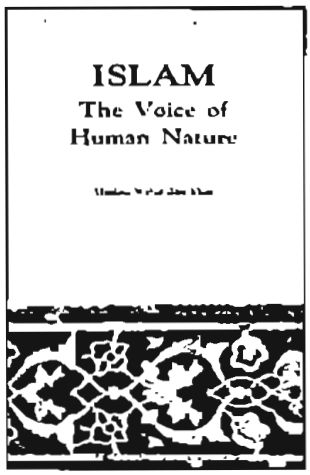
ISLAM
The Voice of
Human Nature

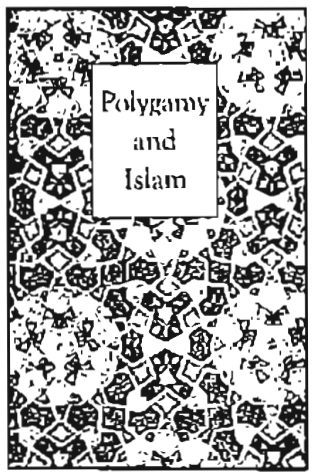
Polygamy
and
Islam

Tabligh
Movement

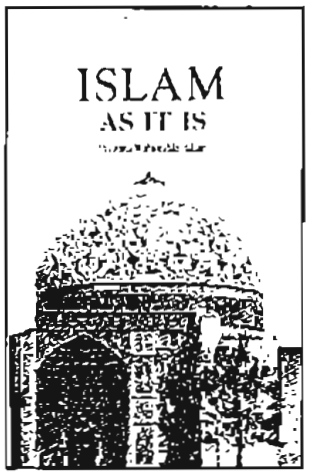
ISLAM
AS IT IS

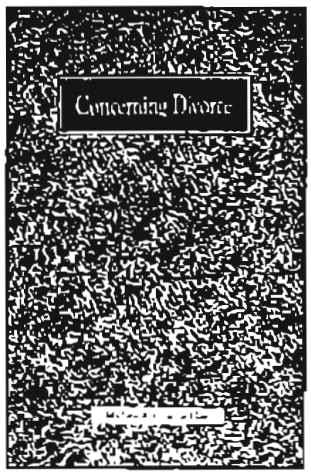
Concerning Divorce

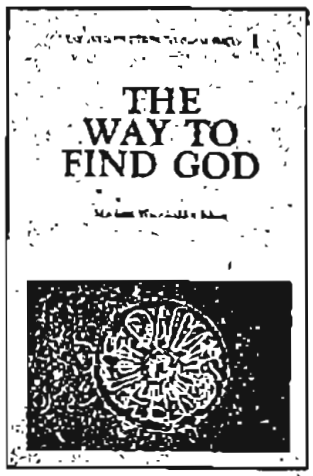
THE
WAY TO
FIND GOD

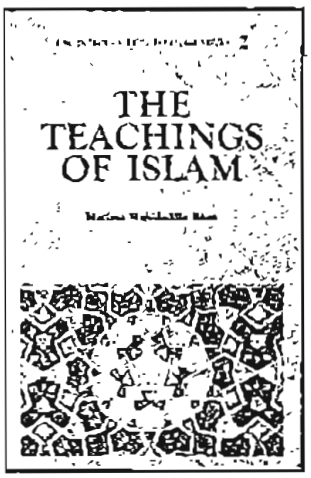
THE
TEACHINGS
OF ISLAM

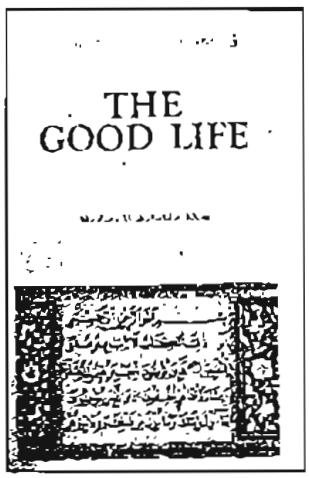
THE
GOOD LIFE

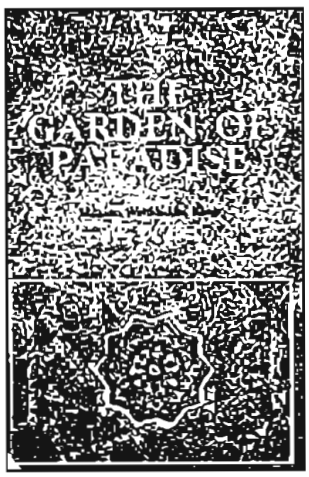
GARDEN OF
PARADISE

THE
FIRE OF
HELL

रास्ते
बन्द नहीं

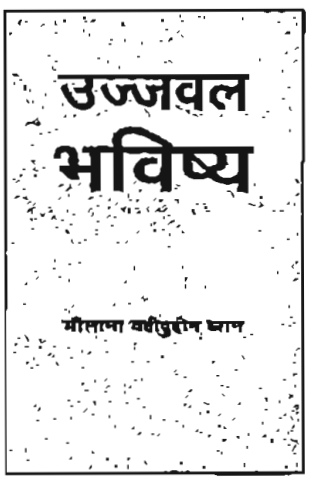
उज्जवल
भविष्य

पवित्र
जीवन

ISLAMIC BOOKS

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Islam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	55.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder (Forthcoming)	—
The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.00
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	95.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
The Story of Hajj (Forthcoming) by Saniyasnain Khan	—
History of the Prophet Muhammad by Philip K. Hitti	75.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam: Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muslim Travel Guide (Forthcoming) Ruqaiyyah Waris Maqsood	—
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.00
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. 4625454, 4611128 • Fax 9111-4697333
e-mail: skhan @ndl.vsnl.net.in • http://www.alrisala.org

Finest collection of books on Islam

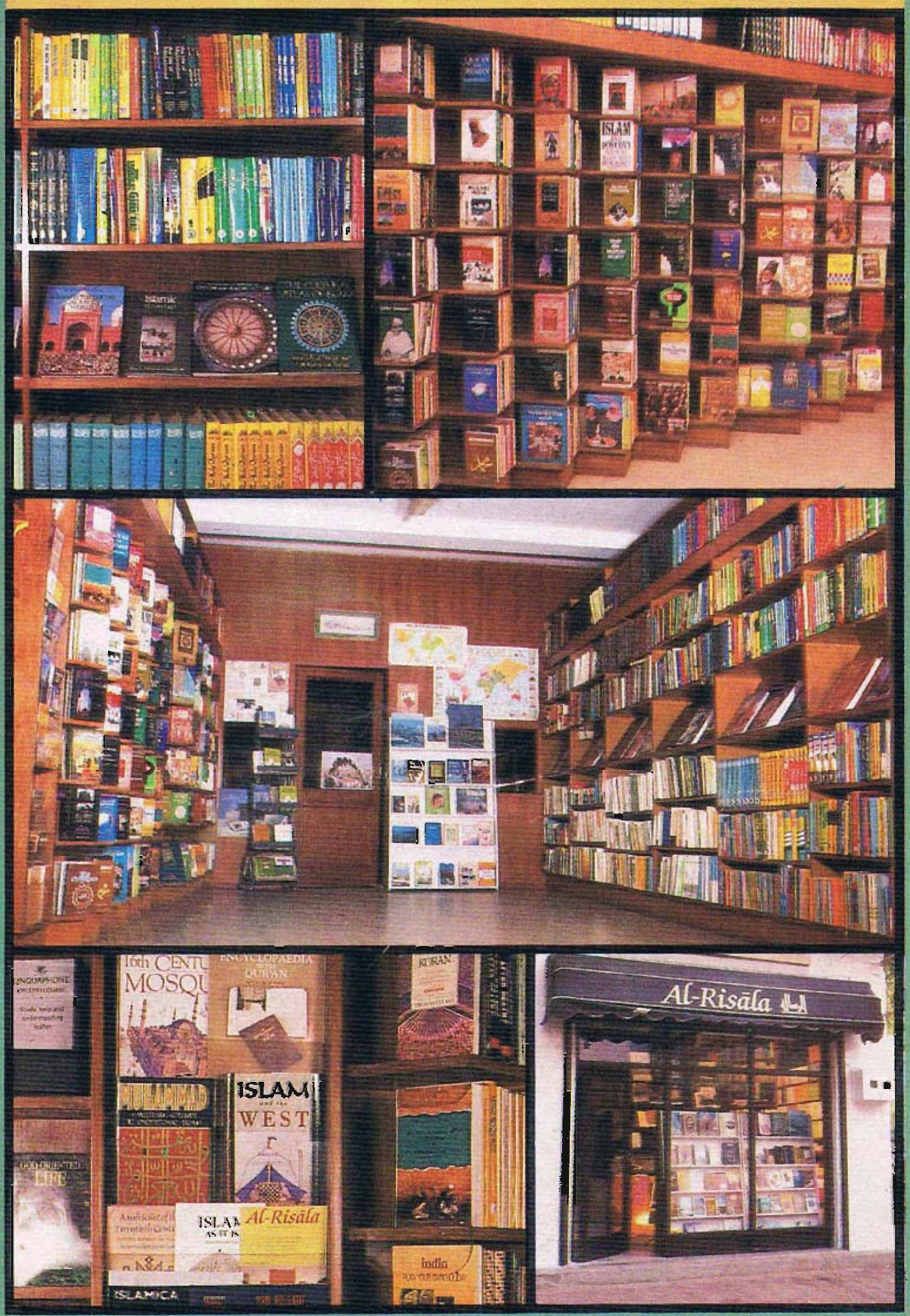

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

Tel. 4611128 Fax 4697333